ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقات اسلامی

علی گڑھ



پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

۲۰۲۰۰۱

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کا سہ ماہی ترجمان

تحقیقات اسلامی

علی گڑھ

(جولائی ——— ستمبر ۸۲ء)

نگراں

مولانا صدرالدین اصلاحی

مدیر

سید جلال الدین عمری

پان والی کوٹھی - دودھ پور - علی گڑھ یوپی ۲۰۲۰۰۱

سہ ماہی **تحقیقات اسلامی** علی گڑھ

جلد ۱ شمارہ ۳

رمضان ۔ ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ
جولائی ۔ ستمبر ۱۹۸۲ء

سالانہ زرتعاون

ہندوستان سے		۲۰ روپے
پاکستان سے	(بذریعہ ہوائی ڈاک)	۵۰ روپے
دیگر ممالک سے	(")	۱۵ ڈالر

فی پرچہ ——— ۵ روپے

طابع ناشر سید جلال الدین عمری نے انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے لئے نیشنل آرٹ پریس - الہ آباد سے چھپوا کر ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، پانی والی کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

حرفِ اغاز

اسلامی علوم میں اقدامی رجحان — سید جلال الدین عمری — ۵

قرآن وحدیث

ایمان اور عمل صالح سے مرد اور عورت کامیاب ہوسکتے ہیں — سید جلال الدین عمری — ۱۱

تحقیق وتنقید

مسلم اساسیت — جناب انوار علی خاں سوز — ۱۷
خانۂ کعبہ اور عربوں کا مذہب (ولیم میور کے خیالات کا جائزہ) — ڈاکٹر محمد ذکی — ۳۱

بحث ونظر

انسانی مساوات اور مذاہب عالم — جناب سلطان احمد اصلاحی — ۶۱
شاہ اسماعیل شہید کی دو اصلاحی تصانیف — ڈاکٹر معظم علی خاں — ۷۶

سیر وسوانح

ہشام کی سیاسی حکمت عملی — ڈاکٹر عبد الباری — ۹۸
مولانا حسین علی عالم بہاری کا اسلامی نظام تربیت — ڈاکٹر احمد سجاد — ۱۱۱

اس شمارہ کے لکھنے والے[1]

۱۔ جناب انوار علی خاں سوز — شعبہ انگریزی، جامعہ ملیہ، نئی دہلی

آپ کے مقالات انگریزی اور اردو کے علمی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ الانصاف الٰہ آباد اور ریڈینس دہلی سے بھی آپ کا تعلق رہا ہے۔

۲۔ ڈاکٹر محمد ذکی — شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آجکل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

۳۔ جناب سلطان احمد اصلاحی — رفیق ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

محمد ابوزہرہ مصری کی کتاب "المجتمع الانسانی فی ظل الاسلام" کا اردو ترجمہ آپ نے "انسانی معاشرہ — اسلام کے سایہ میں" کے عنوان سے کیا جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

۴۔ ڈاکٹر معظم علی خاں — شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ایم ایس سی اور ایم ٹی ایچ کے بعد شاہ اسماعیل شہید پر تحقیقی کام کر کے مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

۵۔ ڈاکٹر عبد الباری — شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ایم اے (آنرس عربی) ایم اے (اردو) بی ایل کرنے کے بعد ہشام بن عبد الملک کی حیات اور عہد پر پٹنہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ عربی کے مشہور شاعر جریر کی شخصیت اور شاعری پر تحقیقی کتاب شائع کی۔ نصابی کتابیں مرتب کیں۔ انگریزی اور اردو دونوں میں لکھتے رہتے ہیں۔

۶۔ ڈاکٹر احمد سجاد — ریڈر شعبہ اردو۔ رانچی یونیورسٹی۔ رانچی

اردو کے صاحب طرز نقاد۔ مدیر مجلہ "ابلاغ" شمشاہی، رانچی، بہار۔ اب تک حسب ذیل تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔ دبستان رام پور کا ایک اہم فن کار۔ عشرت علی صدیقی۔ تنقید و تحریک۔ ہندوستانی مسلمانوں کے بنیادی مسائل اور ان کا حل۔

۷۔ سید جلال الدین عمری — سکریٹری ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

---

[1] جن مضمون نگاروں کا پچھلے شماروں میں تعارف کرایا جا چکا ہے ان کا اس شمارہ میں بہت ہی مختصر اور ہماری بزم میں نئے شریک ہونے والوں کا کسی قدر تفصیل سے تعارف کرایا جا رہا ہے۔

حرفِ آغاز

اسلامی علوم میں اقدامی رجحان

سید جلال الدین عمری

افراد کی طرح قومیں بھی ایک دوسرے کے علوم وفنون اور افکار وخیالات سے استفادہ کرتی ہیں۔ اس استفادے کو غلط اور ناجائز نہیں کہا جاسکتا، بلکہ یہ بعض پہلوؤں سے مفید اور قومی زندگی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اس استفادہ کا انداز اور اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ہر قوم اپنی ذہنی، فکری، ملی اور سیاسی حالت کے لحاظ سے دوسروں سے استفادہ کرتی ہے۔ جس قوم کی فکری بنیاد مستحکم ہوتی ہے، جسے اپنے نظریات اور افکار پر پختہ یقین ہوتا ہے اور جو کارزارِ حیات میں قائدانہ حیثیت کی مالک ہوتی ہے، وہ دوسروں کے علم وفن اور تحقیق وتجزیہ کو آنکھیں بند کرکے نہیں قبول کرتی بلکہ وہ ان میں سے ہر چیز پر ناقدانہ نظر ڈالتی اور ان کے حسن وقبح کو اچھی طرح دیکھتی ہے پھر جس بات کو صحیح اور اپنے لئے مناسب اور موزوں خیال کرتی ہے اسے قبول کرتی ہے اور جس بات کو غلط اور نامناسب تصور کرتی ہے اسے رد کردیتی ہے۔ لیکن جب اس کی فکری اساس کمزور پڑجاتی ہے اور اسے اپنے خیالات پر وہ اعتماد نہیں ہوتا جو اسے ہر رطب ویابس کے قبول کرنے سے روکے تو وہ ہر نئے فکر وخیال پر اندھوں کی طرح ٹوٹ پڑتی ہے بلکہ اپنے نظریات سے دست بردار ہوکر دوسروں کے نظریات کو اختیار کرنے میں ایک طرح کا فخر اور خوشی محسوس کرتی ہے۔ اسے اپنے ہیروں اور جواہرات

پر بھی شرم محسوس ہوتی ہے اور دوسروں کے خزف ریزوں کو بھی حسرت اور رشک سے دیکھتی ہے۔

مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں یونانی علوم سے استفادہ کیا اور ماضی قریب میں مغربی علوم سے استفادہ کیا۔ لیکن چونکہ ان دونوں ادوار میں ان کی ملی سیاسی، ذہنی اور نفسیاتی کیفیت مختلف تھی اس لئے ان کے استفادہ کا انداز بھی بدلا ہوا تھا۔ یہاں ہم اسی کا تھوڑا سا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ مسلمانوں میں یونانی علوم جس وقت منتقل ہوئے اس میں شک نہیں کہ ایک طبقہ اس سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے ان علوم کا مرعوبیت کے ساتھ مطالعہ کیا اس نے اسلام کی روشنی میں ان نظریات کا جائزہ لینے کی جگہ ان نظریات کی عینک سے اسلام کو دیکھا اور اسلام کو ان سے ہم آہنگ کرنے کی نامرغوب و نامعقول کوشش کی۔ لیکن یہ بہت ہی چھوٹا سا طبقہ تھا۔ عام مسلمانوں پر اس کا کوئی خاص اثر نہ تھا۔ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کو اسلام اور اس کی تعلیمات پر پورا پورا ایمان و یقین تھا وہ ابھی کسی غیر اسلامی فکر کو قبول کرنے کے لئے ذہناً تیار نہ تھی۔ اس میں ابھی اس کی بھرپور صلاحیت تھی کہ کسی بیرونی فکر کا صحیح طریقہ سے جائزہ لے کر اس کے قابل قبول یا ناقابل قبول ہونے کا فیصلہ کر سکے۔

۲۔ مسلمان سیاسی طور پر حکمراں تھے، اس لئے ان میں وہ ذہنی پستی یا مرعوبیت نہیں تھی جو بالعموم محکوم اور زیر دست قوموں میں ہوتی ہے، یونان کی حیثیت مسلمانوں کے لئے حاکم قوم کی نہیں تھی۔ انھوں نے یونانی علوم کو اس نظر سے نہیں دیکھا جس نظر سے ایک محکوم قوم حاکم قوم کے نظریات کو دیکھتی ہے۔ بلکہ انھوں نے ایک ایسی قوم کی حیثیت سے ان پر نظر ڈالی جسے دنیا کی تمام قوموں پر سیاسی تفوق اور برتری حاصل تھی۔ وہ دنیا کو درس دینے کی پوزیشن میں تھی۔ ابھی ان سے درس لینے کے لئے تیار نہ تھی۔

۳۔ یونانی علوم نے بحثیں چھیڑی تھیں ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات

وحی و رسالت، حشر و نشر، مادہ و روح، جبر و قدر اور اسی نوعیت کے مابعد الطبیعاتی مسائل سے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مسائل اہم ہیں اور ان کا پوری زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یونانی علوم کا اسلام کی تہذیب، معاشرت، اخلاق، سیاست اور قانون وغیرہ سے براہ راست تصادم نہیں تھا۔ یوں کہنا چاہئے کہ یونانی علوم کا حملہ اسلام کے عقائد پر تھا اس کی سیاسی و اجتماعی زندگی پر نہیں تھا۔ اس لئے زندگی کے یہ گوشے اس کے اثرات سے بڑی حد تک محفوظ تھے۔

۴۔ یونانی علوم سے مسلمانوں نے گہری واقفیت حاصل کی، ان پر عبور حاصل کیا اور ان کی ایسی مستند توضیح و تشریح کی کہ اس پر پورا اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ یہی نہیں مسلمانوں نے ان علوم پر بے لاگ نقد و تبصرہ کیا، کھرے کھوٹے کو پرکھا اور اس بات کی نشاندہی کی کہ ان سے ایک مسلمان کس حد تک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس طرح یہ علوم مسلمانوں میں جہاں اپنی صحیح شکل میں پھیلے وہیں ان کی افادیت و عدم افادیت کے پہلو بھی ساتھ ہی ساتھ واضح ہوتے رہے۔

۵۔ مسلمانوں میں ایسی شخصیتیں بکثرت پیدا ہوئیں جو ایک طرف یونانی علوم پر وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے تو اسلامی علوم میں بھی انھیں تجدید و امامت کا مقام حاصل تھا۔ انھوں نے یونانی علوم کی زد اسلام کے جن عقائد پر پڑ رہی تھی ان کا علمی اور تحقیقی انداز میں جواب دیا اور اس طرح اسلام کی حقانیت ثابت کی کہ یونانی علوم کے کسی بڑے سے بڑے منتقد کے لئے بھی اس کی تردید آسان نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یونانی علوم کا زہر مسلمانوں میں پھیلا تو اس کا تریاق بھی ساتھ ہی ساتھ فراہم ہوتا چلا گیا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی عقائد پر جو وسیع لٹریچر مسلمانوں نے فراہم کیا اس سے ہٹ کر بھی علمائے اسلام نے قرآن، حدیث، فقہ کے مسائل سے بحث کرتے ہوئے ان غلط خیالات کی قدم قدم پر تردید کی ہے جو یونانی علوم کے زیر اثر مسلمانوں میں پھیل رہے تھے اور جن کی وجہ سے ایمان و یقین متزلزل ہو سکتا تھا۔

مغربی علوم مسلمانوں میں جب آئے تو حالات بدل چکے تھے۔

(۱) یہ علوم مسلمانوں میں اس وقت آئے جب کہ انھیں اپنے عقائد پر وہ یقین نہ تھا جو دور اول کے مسلمانوں کو تھا۔ دین کا واضح تصور ان کے ذہنوں سے اوجھل ہو رہا تھا، وہ مختلف قسم کے اوہام و خرافات میں گرفتار تھے، ان کی سیرت و کردار میں وہ پاکیزگی باقی نہیں رہی تھی جو اسلام نے عطا کی تھی۔ دین سے علمی و فکری بے خبری اور عملی دوری نے اس بات کو آسان بنا دیا تھا کہ کوئی بھی فلسفہ انھیں اپنی جگہ سے ہٹا دے۔ چنانچہ مغربی علوم کا سیلاب آیا تو وہ اس سے بری طرح متاثر ہوئے یونانی علوم سے ان کا تاثر محدود پیمانے پر تھا اور مغربی علوم نے انھیں وسیع پیمانہ پر متاثر کیا۔

(۲) مغربی علوم کی حیثیت ایک حاکم قوم کے علوم کی تھی مسلمان مغرب کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے ان سے ذہنی طور پر مرعوب تھے۔ انھوں نے اسی مرعوبیت کے ساتھ مغربی علوم سے استفادہ کیا۔ وہ مغرب کے کسی خیال اور فلسفہ کے بارے میں یہ سوچنے کے لئے تیار نہ تھے کہ وہ غلط ہو سکتا ہے اس لئے مغرب نے اسلام پر جس پہلو سے بھی اعتراض کیا وہ اسے صحیح سمجھنے لگے۔

(۳) یونانی علوم نے بعض خالص عقلی مسائل چھیڑے تھے لیکن مغرب نے پوری زندگی سے بحث کی اور اسے ایک خاص رخ دینا چاہا۔ اس نے مسلمانوں کے عقائد ہی کو نہیں ان کی تہذیب، معاشرت، سیاست، قانون غرض ان کے پورے دین اور پوری تاریخ کو نشانہ بنایا۔ اسلام نے زندگی کے جس پہلو سے متعلق جو ہدایات بھی دیں ان کا مذاق اڑایا اور آج کے دور کے لئے اسے ناقابل قبول قرار دیا۔

(۴) مغربی فکر خالص عقلی فلسفہ کا نام نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کی ایک دنیا وجود میں آئی۔ جس نے پرانی دنیا کو اور اس کے مسائل کو بڑی حد تک بدل دیا۔ ان حالات میں اسلام کی طرف رجوع کرنے اور اس سے راہنمائی حاصل کرنے کا حوصلہ بھی شاذ و کم ہی لوگ اپنے اندر پاتے تھے۔

(۵) مسلمانوں میں یونانی علوم کے ماہرین تو بہت پیدا ہوئے لیکن ایسے افراد شاذ و نادر ہی تھے جنھوں نے مغربی فکر و فلسفہ کا تفصیلی مطالعہ کیا ہو اور جو اس کے مستند شارح اور ترجمان سمجھے جاتے ہوں۔ ایسے لوگ تو اور بھی کم تھے جن کی مغربی علوم پر ناقدانہ نظر ہو اور جو ان کی خوبیوں اور خامیوں کا خود مغرب کے معیار کے مطابق تجزیہ و تحلیل کر سکیں۔

(۶) یہاں ایک خلا اور بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ یہ کہ دوراول میں اسلامی علوم کے ماہرین اور مجددین یونانی علوم پر بھی پورا عبور رکھتے تھے۔ وہ بجا طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ یونانی علوم کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا اسلام کی طرف سے جواب دیں جس طرح دینی علوم میں ان کی دقتِ نظر کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا اسی طرح یونانی علوم میں ان کی گہری بصیرت سے بھی انکار ممکن نہ تھا۔ لیکن مغربی علوم کے آنے کے بعد مسلمان اہل علم دو طبقوں میں بٹ گئے۔ ایک وہ جو مغربی علوم پڑھتا پڑھاتا تھا اور اس سے مرعوب و متاثر تھا دوسرا وہ جو دینی علوم کی درس و تدریس میں لگا ہوا تھا۔ مختلف اسباب کی بنا پر دونوں کے مطالعہ و تحقیق کے میدان ایک دوسرے سے الگ تھے۔ جو لوگ مغربی علوم پڑھ رہے تھے وہ دینی علوم سے ناواقف تھے اور دینی علوم کے ترجمان مغربی افکار و مسائل سے بے خبر تھے۔ نہ تو پہلا طبقہ اسلام کی صحیح ترجمانی کر سکتا تھا اور نہ دوسرا طبقہ مغربی افکار کے جائزہ اور تنقید کی پوزیشن میں تھا جو لوگ صحیح معنی میں اسلام کی طرف سے جواب دے سکتے تھے وہ مغربی فکر، اس کے اٹھائے ہوئے سوالات اور سائنسی دور کی پیچیدگیوں کو پوری طرح نہیں سمجھتے تھے اور جو مغربی فکر سے واقف تھے اسلام کے بارے میں ان کی معلومات محدود، ناقص بلکہ غلط اور غلط تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب کی طرف سے اسلام پر تابڑ توڑ حملے ہوتے رہے اور اسلام کی صحیح معنوں میں ترجمانی نہیں ہو سکی۔

اس میں شک نہیں بعض لوگوں نے مغرب کے اعتراضات کا جواب دینے کی

بھی کوشش کی لیکن یہ لوگ سخت مرعوبیت کا شکار تھے۔ ان کے نزدیک غلط اور صحیح کا پیمانہ مغرب تھا۔ حق وہ تھا جسے مغرب حق کہے اور جس بات کو مغرب کی سند حاصل نہ ہو وہ باطل تھی۔ وہ ان تعلیمات کے ذکر سے بھی شرمندگی محسوس کرتے تھے جن پر مغرب کو اعتراض تھا اور ان کی ایسی رکیک تاویلات کرنے سے بھی گریز نہ کرتے جن سے ان تعلیمات کا حسن ہی ختم ہو جائے۔ وہ اسلام کو مغرب کے تابع دیکھنا چاہتے تھے، چاہے اس کے لئے انھیں اسلام کی صورت ہی مسخ کیوں نہ کرنی پڑے۔

ان حالات میں زمانہ کی رفتار کے ساتھ بعض خاص تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

(۱) مغربی تہذیب کے عروج کے ساتھ اس کی خامیاں اور اس کے نتائج بھی سامنے آنے لگے یہ نتائج بعض پہلوؤں سے اتنے گھناؤنے تھے کہ خود مغرب چیخ اٹھا۔ اس کی وجہ سے مغربی تہذیب کا طلسم ٹوٹنے لگا اس کے ارفع و اعلیٰ اور مکمل ہونے کا تصور باقی نہیں رہا اور وہ مرعوبیت جو ذہنوں پر قائم تھی کم ہونے لگی۔

(۲) مغربی فکر کے غلبہ کی ایک وجہ مسلمان ملکوں پر اس کا سیاسی غلبہ بھی تھا۔ یہ غلبہ بیسویں صدی میں عملاً ختم ہوا تو مغرب کے افکار کی حیثیت حاکم قوم کے افکار کی نہیں رہی اب اس کے بارے میں زیادہ صحیح طریقہ سے سوچا جانے لگا اور مرعوبیت کی جگہ بے لاگ تجزیہ نے لے لی۔

(۳) مسلمانوں میں ایسے افراد پیدا ہونے شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھنے لگی جو اسلام کے صحیح علم کے ساتھ مغرب کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جس اعتماد کے ساتھ اسلام کی ترجمانی کر سکتے تھے اسی اعتماد کے ساتھ مغرب کے بارے میں بھی بول سکتے تھے۔ انھوں نے باخبر افراد کی طرح مغرب پر تنقید کی اور اسلام کو پوری جرأت اور ہمت کے ساتھ پیش کیا۔

(۴) اس کے ساتھ ایک اہم تبدیلی یہ آئی کہ مسلمانوں میں اسلام کے احیاء کا جذبہ مختلف شکلوں میں ابھرا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اسلام ہی ان کی مشکلات اور مسائل کا حل ہے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ مغربی فکر کے اثرات کو دل و دماغ سے نکالا جائے اور اس کی جگہ اسلام کی برتری کا نقش بٹھایا جائے چنانچہ آج یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں اسلام سے وابستگی بڑھ رہی ہے اور وہ مغرب کو محض ایک سراب سمجھ رہے ہیں۔

اس طرح اسلام کی ترجمانی اب دفاعی دور سے نکل کر اقدامی دور میں داخل ہو چکی ہے۔ امید ہے یہ دور اور ترقی کرے گا اور اسلام اپنی صحیح شکل میں زیادہ سے زیادہ نکھرتا چلا جائے گا۔

قرآن وحدیث

ایمان اور عمل صالح سے
مرد اور عورت کامیاب ہو سکتے ہیں

سید جلال الدین عمری

اسلام کے نزدیک ایمان اور عمل صالح دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لئے ایک لازمی شرط ہے۔ جو اس شرط کو پورا کرے گا وہ دونوں جہاں میں سرخرو اور کامیاب ہوگا۔ جس کے اندر نہ ایمان ہو اور نہ عمل صالح اسے تباہی اور بربادی کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ ایمان بعض غیبی حقیقتوں کو ماننے کا نام ہے اور خدا کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنا عمل صالح ہے۔ یہ دو لفظ اسلام کے پورے نظام فکر و عمل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسلام چاہتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں ہی ایمان اور عمل صالح کے سانچہ میں ڈھل جائیں۔ اور بے یقینی اور بدعملی کی دلدل سے نکل آئیں۔ تاکہ خدا کی پکڑ سے محفوظ رہیں اور اس کے انعام واکرام کے حقدار بن جائیں۔ یہ بات قرآن مجید میں بار بار اور بڑی صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا یہ دنیا فانی اور بے حقیقت ہے۔ اصل اہمیت آخرت کی ہے جہاں کی زندگی ابدی اور دائمی ہے جو فرد بشر بھی دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دے گا اور خدا کے دین پر مشکلات کے باوجود ثابت قدم رہے گا وہ اسے دنیا میں پاکیزہ زندگی اور آخرت میں بہترین اجر عطا کرے گا۔ یہ اللہ کا قانون ہے اور اس کے قانون میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ ارشاد ہے:۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا — جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ تو ختم ہو جائے

عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ	گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ ہمیشہ
الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ	باقی رہے گا اور ہم صبر کرنے والوں کو
بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝	ان کے بہترین اعمال کا جو وہ کر رہے۔
مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ	تھے ضرور اجر دیں گے جس نے بھی نیک
ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ	کام کیا چاہے وہ مرد ہو یا عورت،
فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً	بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے (دنیا
وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ	میں) پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝	جو اچھے عمل کر رہے تھے ان کا اجر انھیں
(النحل ۹۵، ۹۶)	(آخرت میں) ضرور عطا کریں گے۔

یہی بات ایک دوسری جگہ اس طرح کہی گئی ہے:۔

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا	یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ سامان
مَتَاعٌ وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ	ہے اور آخرت ہی ہمیشہ رہنے کی جگہ
دَارُ الْقَرَارِ ۝ مَنْ عَمِلَ	ہے۔ جو شخص بھی کوئی برائی کرے گا
سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا	تو اسے اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا اور
وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ	جو کوئی نیک کام کرے گا، چاہے وہ
اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ	مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ	ہو تو یہ سب لوگ جنت میں جائیں
فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ	گے اور وہاں انھیں بے حساب
(المومن: ۳۹، ۴۰)	رزق دیا جائے گا۔

مذہب کی دنیا میں بعض جماعتیں اس فریب میں مبتلا رہی ہیں کہ وہ خدا کی محبوب ہیں اس لئے ان کے ساتھ وہ خصوصی معاملہ کرے گا۔ ان کے جرائم پر اس طرح گرفت نہیں ہوگی جس طرح دوسروں کی ہوگی۔ قرآن مجید نے اس غلط خیال کی تردید کی اور فرمایا

اللہ کے ہاں فیصلہ اس بنیاد پر نہیں ہوگا کہ کون کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ وہاں انسان کے ایمان وعمل کو دیکھا جائے گا۔ جو غلط کار ہوگا وہ اپنے کئے کی سزا پائیگا اور جو بھی ایمان وعمل صالح سے آراستہ ہوگا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔ فرمایا:۔

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ	نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے
أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ	اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر، جو
سُوءًا يُجْزَ بِهِ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهُ	بھی برا عمل کرے گا اس کی سزا اسے
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝	دی جائے گی اور وہ اللہ کے مقابلہ
وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ	میں اپنا کوئی حامی و ناصر نہیں پائے
مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ	گا۔ اور جو اچھے عمل کرے گا، چاہے
فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ	وہ مرد ہو یا عورت، اگر وہ مومن ہے
وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ۝	تو یہ سب لوگ جنت میں جائیں
(النساء: ۱۲۳، ۱۲۴)	گے اور ذرہ برابر ان کی حق تلفی نہ ہوگی۔

ان آیتوں میں بعض اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ

۱۔ عورت اور مرد میں سے کوئی بھی نہ تو پیدائشی طور پر پاپی یا گناہ گار ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بے گناہی کی سند ملی ہے۔

۲۔ نہ تو مرد کا محض مرد ہونا عزت و سرفرازی کی ضمانت ہے اور نہ عورت کا عورت ہونا اس کی ذلت اور پستی کی دلیل ہے۔

۳۔ کامیابی اور ناکامی مرد کی ہو یا عورت کی ایمان اور عمل صالح سے وابستہ ہے۔ ان میں سے کسی کی کامیابی کے لئے بھی اللہ نے کوئی اور شرط نہیں رکھی ہے۔ جو اپنے ایمان اور عمل میں جتنا آگے ہوگا اتنا ہی کامیاب ہوگا اور جو اس میں جس قدر پیچھے ہوگا اسی قدر ناکام رہے گا۔

۴ - ایمان اور اعمال صالح کے ذریعہ اونچے سے اونچے درجات حاصل کرنے کی اللہ تعالیٰ نے مرد میں بھی صلاحیت رکھی ہے اور عورت میں بھی۔ اس لئے دونوں کو اس میدان میں کسی برتری یا کمتری کے احساس کے بغیر آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

یہ وہ حقیقتیں ہیں جن کا قرآن مجید میں بار بار ذکر ہوا ہے اور انھیں مختلف پہلوؤں سے سمجھایا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ کہا گیا ایسے مرد اور عورتیں جو اپنے ایمان میں سچے اور مخلص ہیں، قیامت میں ان کو نور نصیب ہوگا وہ روشنی میں اپنا راستہ طے کریں گے۔ اور ان کو جنت کی خوشخبری سنائی جائے گی۔ یہ وہ کامیابی ہے کہ اس سے بڑی کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس کے برخلاف ایمان کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے مرد اور عورتیں سب کے سب اندھیرے میں ہوں گے۔ انھیں کہیں سے روشنی نہیں ملے گی اور ان کا انجام خدا کے منکروں کے ساتھ ہوگا اور دونوں ہی جہنم کے مستحق قرار دیئے جائیں گے۔ ارشاد ہوا۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ	اس دن تم دیکھو گے ایمان والے مردوں
يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ	اور عورتوں کو کہ ان کا نور ان کے آگے
وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرَاكُمُ	اور ان کے دائیں دوڑ رہا ہوگا ان سے
الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن	کہا جائے گا کہ آج خوشخبری ہے
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ	تمہارے لئے ایسی جنتیں ہیں جن کے
فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ	نیچے نہریں بہہ رہی ہیں ان میں ہمیشہ
الْعَظِيمُ ۝ يَوْمَ يَقُولُ	رہو گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔ اس
الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ	روز منافق مرد اور عورتیں ایمان
لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُونَا	والوں سے کہیں گے ذرا ہماری طرف
نَقْتَبِسْ مِن نُّورِكُمْ قِيلَ	دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ
ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ	اٹھالیں، ان سے کہا جائے گا پیچھے

فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ط فَضُرِبَ
بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ
فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ
مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝
يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ
مَّعَكُمْ ط قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ
فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ
وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ
حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ
بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ فَالْيَوْمَ
لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ
فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ط
مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ط
هِيَ مَوْلٰىكُمْ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ

(الحدید ۱۲-۱۵)

پلٹ جاؤ اور اپنا نور تلاش کرو۔
پھر ان کے درمیان میں ایک دیوار
کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک
دروازہ ہوگا، اس کے اندر رحمت
ہوگی اور باہر عذاب۔ وہ مومنوں سے
پکار کر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ
نہ تھے؟ مومن جواب دیں گے ہاں
ساتھ تھے مگر تم نے اپنے آپ کو فتنہ
میں ڈالا، انتظار کرتے رہے، شک
میں پڑے رہے اور جھوٹی توقعات
تمہیں فریب دیتی رہیں یہاں تک کہ
اللہ کا فیصلہ آگیا اور اللہ کے معاملے
میں اس بڑے دھوکے باز (شیطان)
نے تمہیں دھوکہ میں رکھا لہٰذا آج نہ تم
سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور
نہ ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا۔
تم سب کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ وہی تمہاری
خبر گیری کرنے والی ہے اور یہ بدترین
انجام ہے۔

اس طرح اسلام نے پوری قوت کے ساتھ یہ بات کہی کہ عورت اور مرد دونوں ہی کی کامیابی ایمان خالص اور عملِ صالح سے وابستہ ہے۔ اس کے سوا ان کی نجات اور فلاح کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ ان

میں سے جس کسی کے پاس ایمان ویقین کی دولت اور عملِ صالح کا ذخیرہ ہوگا وہ کامیاب ہوگا۔ جس کا دامن ان دونوں باتوں سے خالی ہوگا وہ ناکام ونامراد ہوگا۔ اس معاملہ میں خدا کا قانون بے لچک ہے۔ وہ نہ تو عورت کے ساتھ کوئی رعائت کرتا ہے اور نہ مرد کے ساتھ۔

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کے شائع کردہ

چار انگریزی کتابچے

(1) Islam ___ the universal truth

اس میں علمی انداز میں اسلامی عقائد کو پیش کیا گیا ہے۔

(2) Islam and the unity of man kind

اسلام وحدت بنی آدم کا علمبردار ہے اس سلسلے میں اس کی کیا تعلیمات ہیں؟ یہ اس کتابچہ کا موضوع ہے۔

(3) Pitfalls on the path of Islamic movement

داعی حق کو کن کن خطرات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے ان کی تفصیلات فاضل مصنف نے نہایت دلنشیں پیرائے میں بیان کی ہیں۔

(4) How to study Islam

دین کا مطالعہ کیوں ضروری ہے۔ مطالعہ کے بنیادی تقاضے کیا ہیں اور کن کن چیزوں کے مطالعہ سے دین کا علم حاصل ہوتا ہے؟ ان پر اس کتابچہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

تحقیق و تنقید

مسلم اساسیت

MUSLIM FUNDAMENTALISM

جناب انوار علی خاں سوز

دین کے احیاء اور تجدید کی جب بھی کوئی کوشش ہوئی مغرب نے اس کے لئے کوئی نہ کوئی ایسی اصطلاح استعمال کرنی شروع کر دی جس سے اس کی تصویر مسخ ہو جائے اور لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں۔ آج کل اسی طرح کی ایک اصطلاح FUNDAMENTALISM کی چلی ہے۔ جناب انوار علی خاں صاحب سوز نے اس اصطلاح کا تاریخی پس منظر بیان کرنے کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کا اطلاق ان تحریکوں پر بالکل نہیں ہوتا جو موجودہ دور میں احیاء دین کا کام کر رہی ہیں۔ مضمون کی بعض تفصیلات سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے خیال میں یہ اس موضوع پر ایک سنجیدہ اور علمی تجزیہ ہے اس پہلو سے اسے پیش کیا جا رہا ہے۔ (جلال الدین)

فنڈامنٹلزم کی اصطلاح امریکہ سے مستعار لی گئی ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ فنڈامنٹلزم یعنی اساسیت کی تحریک جنگ عظیم اول کے بعد شروع ہوئی ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ بائبل کو لفظ بہ لفظ صحیح سمجھا جائے اور بائبل کی کوئی

نئی تعبیر نہ کی جائے۔ بائبل میں جن معجزات کا ذکر ہے انھیں حرف بحرف صحیح مانا جائے۔ مسیح کے بغیر باپ کی پیدائش اور ان کا آسمان پر جانا بھی بالکل صحیح تسلیم کیا جائے۔ اس تحریک کا ایک خاص مقصد یہ بھی تھا کہ نظریۂ ارتقاء کو غلط ثابت کیا جائے۔

مگر "اساسیت" کی تحریک کی ابتداء درحقیقت ۱۸۳۰ء سے شروع ہوئی تھی۔ یہ تحریک ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک کاشتکار ولیم ملبر نے شروع کی تھی۔ اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ۱۸۴۳ء میں مسیح دوبارہ تشریف لائیں گے اور "الف مبارک" شروع ہو جائے گا۔ اس کے پیروؤں کی تعداد ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک ہو گئی تھی۔ لیکن جب ۱۸۴۴ء ختم ہو گیا اور مسیح دوبارہ تشریف نہ لائے تو لوگوں کے دماغ میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ الف مبارک کے ماننے والوں کو "الفیئن" (MILLEARIANS) کہنے لگے۔ مسیح کی آمد کے مخالفوں نے اس بات کو لے کر بائبل کی لفظی تشریح کے بجائے معنوی تشریح شروع کر دی۔

۱۸۳۵ء میں انگلینڈ میں بھی اس تحریک کا آغاز ہو گیا تھا۔ ایونجلی کل چرچ نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تحریک کی وجہ سے امریکہ میں ولیم ملر (WILLIAM MILLER) کی اچھی خاصی شہرت ہو گئی۔ مگر جب مسیح دوبارہ تشریف نہ لائے تو ساری تحریک بے جان ہو کر رہ گئی اور انگلستان میں بھی لوگوں نے "الف مبارک" کی دوسری تشریح کرنی شروع کر دی۔

اس کے بعد ۱۸۷۰ء تک یہ تحریک بے جان ہی پڑی رہی۔ لیکن جب چرچ کو جدید خیالات سے خطرہ لاحق ہوا تو پادریوں نے ان خیالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ الفیئن کی تحریک ابھی تک پوری طرح ختم نہیں ہوئی اس کے ماننے والوں نے مسیح کی دوبارہ آمد کے تخیل کو تو چھوڑ دیا تھا مگر وہ "الف مبارک" کا انتظار کر رہے تھے ان کا خیال تھا کہ مسیح ایک خاص وقت پر تشریف لائیں گے۔ اس لئے ہمیں مسیح کی آمد کی تیاری کرنی چاہئیے اور عیسائیت کو جدید خیالات سے بچانا چاہئیے۔

امریکہ میں 'ایپس کوپیلین' (EPISCOPELION) اور 'پرس بی ٹیرس (PRESBITERIAS) چرچ نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تحریک میں مختلف فرقوں کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اس تحریک کی طرف سے ایک رسالہ "سچائی" (TRUTH) کے نام سے نکلتا تھا۔ اس رسالہ کا ایڈیٹر جیمس ایچ بروکس (JAMES H.BROOKS) (۱۸۳۰ء سے ۱۸۹۷ء) الف مبارک کے ماننے والے امریکہ کے بڑے شہروں میں کانفرنس کرتے تھے نیاگرہ (NIAGRA) میں ۱۸۹۹ء تک ان لوگوں کی کانفرنسیں ہوتی رہیں نیویارک میں بھی ان لوگوں نے ایک کانفرنس کی۔

"الف مبارک" کے ماننے والے یہ کہتے تھے کہ عیسائی معاشرہ مسیح کے آنے کے بعد ہی ٹھیک ہوگا۔ لیکن یہ کسی تاریخ کا تعین نہیں کرتے تھے۔ ان لوگوں کو ماقبل الفئین کہا جاتا تھا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنھیں مابعد الفئین کہا جاتا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ امریکہ میں ہر طرح کی معاشی، معاشرتی اور اخلاقی ترقی ہو رہی ہے۔ اور مسیح علیہ السلام اس وقت تشریف لائیں گے جب کہ دنیا ان کی آمد کے لئے تیار ہو چکی ہوگی۔ لیکن ملر کے حامی جنھیں ماقبل الفئین کہا جاتا ہے وہ اس سلسلے میں زیادہ پرامید نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ عیسائی سماج مسیح کے آنے کے بعد ہی سدھرے گا۔ ان کا خیال تھا کہ مسیح علیہ السلام انیسویں صدی کے آخر تک ضرور آجائیں گے۔ ملر کے حامی سمجھتے تھے کہ مسیح انھیں کے زمانے میں تشریف لے آئیں گے ۱۸۷۰ء میں جو تحریک پیدا ہوئی اس کے حامی بائبل کی نئی ترجمانی کرتے تھے۔ مگر ۱۸۴۰ء میں جو تحریک پیدا ہوئی تھی اس کے حامی بائبل کی نئی تعبیر کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔

بائبل پر سخت تنقید کی وجہ سے بہت سے عیسائی تقریباً کفر کی حد تک پہونچ گئے تھے مگر ملر کی تحریک جسے ماقبل الفئین کہا جاتا تھا اب ابھر کر اوپر آنے لگی اور اسی کا نام 'الف مبارک' کے ماننے والا ہو گیا۔ اسی کو الفئین کی تحریک کہا جانے

لگا۔ اسی زمانے میں الف مبارک کے ماننے والوں کو ایک عظیم شخصیت مل گئی جس کا نام 'ڈوائٹ ایل موڈی' (DWIGHT L MOODY) تھا۔ یہ شخص ۱۸۹۹ء تک زندہ رہا۔ الف مبارک کے ماننے والے ان عیسائی مبلغوں کو جو دوسرے ممالک میں کام کرتے تھے امداد بھی دیتے تھے۔ ان لوگوں نے پرنسٹن (PRINCETON) میں ایک دارالعلوم بھی کھولا جس میں بائبل کی لفظی تشریح پر پورا زور دیا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے یونیورسٹی کے پروفیسروں کو تبادلۂ خیالات کے لئے بلایا۔

الف مبارک کے ماننے والوں نے قدامت پسندوں اور ایونجلی کل پروٹسٹنٹس (EVENGETICAL PROTESTANTS) کے ساتھ مل کر کام کیا۔ ان لوگوں نے ۱۹۰۹ء میں بارہ کتابچے چھپوائے۔ ان کتابچوں کا نام "اساسیات" FUNDAM-NTAL تھا۔ ان بارہ رسالوں میں بائبل پر تنقید کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ ان رسائل میں بائبل کی جدید ترجمانی کو غلط ثابت کیا گیا تھا۔ جو دلائل بائبل کی لفظی تشریح کے حق میں پرنسٹن کے دارالعلوم میں جمع کئے گئے تھے۔ ان کی رد سے نئی تعبیر کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ بارہ رسالے ڈھائی لاکھ کی تعداد میں مفت تقسیم کئے گئے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۵ء تک چلتا رہا۔

جیمس ایچ بروکس (JAMES H BROOKS) اس تحریک کو کافی عرصہ تک سنبھالے رہا۔ مگر ۱۸۹۷ء اس کا بھی انتقال ہو گیا ۱۹۱۲ء تک نیاگرا کانفرنس کے سارے حامی مر گئے۔ ان سارے رہنماؤں کے بعد الف مبارک کے ماننے والوں میں اختلافات رونما ہونے لگے۔ الفئین دو حصوں میں بٹ گئے دونوں کی طرف سے دو رسالے نکلنے لگے۔ ایک کا نام واچ وارڈ اینڈ ٹرتھ (WATCH WORD & TRUTH) تھا اور دوسرے کا نام "ہماری امید" (TO OUR HOPE) تھا۔ ان دونوں رسالوں میں ایک دوسرے کے عقائد پر تنقید کی جاتی تھی اور اپنے عقائد کو صحیح ثابت کیا جاتا تھا۔

جنگ عظیم اوّل کے بعد امریکہ میں سخت اخلاقی انحطاط رونما ہونے لگا۔ الف مبارک کے جاننے والے اس اخلاقی زوال سے سخت پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کسی طرح اس اخلاقی زوال کو روکا جائے۔ انھوں نے امریکہ کے مختلف شہروں مثلاً نیویارک، فلاڈلفیا وغیرہ میں بہت سی کانفرنسیں کیں۔ ان کانفرنسوں میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی چنانچہ الفئین (MILLENARIANS) نے اپنا نام بدل کر عالمی عیسائی اساسیات تنظیم (WORLD'S CHRISTAN FUNDAMENTAL ASSOCI-ATION) رکھ لیا۔ الفئین (MILLENARIAN) کو اساسین (FUND-AMENTALISTS) کہا جانے لگا۔

اساسیئن نظریہ ارتقاء کے سخت مخالف تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ نظریۂ ارتقاء کو پبلک اسکولوں میں نہیں پڑھانا چاہیئے۔ ٹینیسی (TENESEE) نے ایک قانون اس سلسلے میں پاس کر دیا مگر اس قانون کو عدالت میں چیلنج کیا گیا۔ امریکہ کے مختلف شہروں میں اس قسم کے جلسے کئے گئے مگر ان جلسوں میں زیادہ لوگ شریک نہ ہوئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۸ء تک چلتا رہا۔

جنگ عظیم اول کے بعد اخلاقی زوال کے ساتھ کمیونزم کا خطرہ بھی بڑھ رہا تھا لوگ بائبل کی نئی تعبیر کو اختیار کر رہے تھے۔ اساسیئن ایک طرح سے محدود ہو کر رہ گئے تھے ایپس کوپل۔ پرنس لی ٹیرین۔ بپٹیسٹ اور میتھوڈسٹ چرچ کے لوگ ان نئی تعبیروں کو ماننے لگے۔ ہنری ایمرسن فوش ڈک (HENRY EMERSON FOSDUK) جدید تعبیر کا نمائندہ سمجھا جانے لگا۔ فوس ڈک نے ایک بار یہ کہہ دیا تھا کہ "کیا اساسیئن کی فتح ہوگی"؟ ہنری ایمرسن فوس ڈک بپٹسٹ چرچ سے تعلق رکھتا تھا۔ الف مبارک کے جاننے والوں نے اسے چرچ سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس میں پندرہ ممبر شامل تھے۔ کمیشن اس نتیجے پر پہونچا کہ بپٹسٹ چرچ میں اختلاف آرا کو برداشت کیا جانا چاہیئے۔ بہرحال ہنری ایمرسن

فوس ڈک کو چرچ سے باہر نہیں نکالا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اساسیئن (FUNDAME - NTALISTS) کو فتح حاصل نہ ہو سکی۔

اساسیئن کے مندرجہ ذیل اصول تھے۔ اول بائبل کو صرف کلام الٰہی سمجھا جائے ثانیاً یہ مانا جائے کہ مسیح کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوئے ثالثاً کفارہ مسیح کا عقیدہ حرف بحرف تسلیم کیا جائے۔ رابعاً از سر نو پیدائش اور معجزات مسیح کو مکمل طور پر تسلیم کیا جائے۔

اساسیئن کے اختلافات تقریباً ۱۹۲۰ء تک ختم ہو چکے تھے مگر ان کا استدلال ختم نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں اساسیئن کے نظریات نے پھر زور پکڑنا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۰ء تک اساسیئن عوام میں زیادہ مشہور نہیں رہے۔ اس دوران میں اکثر اساسیت پسندوں نے ایک نیا فرقہ بنا لیا۔ یہ فرقہ بہت چھوٹا تھا۔ اس فرقہ میں ہر فرقہ کے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ اساسیت پسندوں کا یہ طبقہ اپنے پرانے عقیدوں پر جمع رہا۔

جنگ عظیم ثانی کے بعد اساسیئن میں خوشحالی پھیل گئی۔ ان لوگوں نے صنعتی ترقی اور سائنس اور ٹکنالوجی کو قبول کر لیا۔ انھوں نے اپنے عقائد کو پھیلانے کے لئے ریڈیو اور ٹیلیویژن کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اسی دور میں بلی گراہم (BILLY GRAHAM) اساسیئن کا سب سے بڑا نمائندہ تھا۔ بلی گراہم نے سائنس کی مخالفت بند کر دی۔ اس نے کہا کہ اگر امریکہ نے اپنے اخلاقی زوال کو نہ روکا اور دولت کو غلط طریقے پر استعمال کیا تو امریکہ کو طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ دولت کی فراوانی کے ساتھ امریکہ میں جرائم کی رفتار بھی بڑھنے لگی۔ گھریلو زندگی میں طرح طرح کے مسائل پیدا ہونے لگے اب اساسیئن کا مقصد ان جرائم کو روکنا اور خاندانی روایات کو برقرار رکھنا قرار پایا۔

جس طرح جنگ عظیم اول سے پہلے نظریہ ارتقار کی مخالفت کی گئی تھی اسی طرح جنگ عظیم ثانی کے بعد کمیونزم کی مخالفت شروع ہوئی۔ اساسیئن یہ سمجھتے تھے کہ اب عیسائیت

کو کمیونزم سے خطرہ ہے۔ لہٰذا اس کی شدید مخالفت کی گئی۔ اس وقت اساسیئن کا نمائندہ رسالہ 'آج کا عیسائی' 'CHRISTIAN TODAY' تھا۔

اساسیئن نہ شراب پیتے ہیں نہ سگریٹ نوشی کرتے ہیں اور نہ رقص میں حصہ لیتے ہیں۔ بعض لوگ ان میں سے فلمیں بھی نہیں دیکھتے۔ اکثر اساسیئن ۱۹۱۰ء میں جو کانفرنس نیاگرہ میں ہوئی تھی اسی کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔ اور انھیں عقائد کو مانتے ہیں۔ مثلاً بائبل وحی الٰہی ہے۔ بائبل کے الفاظ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ تثلیث کا عقیدہ۔ انسانی کمزوری اور نجات کے لئے دوسری پیدائش۔ کفارہ مسیح۔ مسیح پر ایمان لانے والوں کے لئے نجات کی بشارت اور مسیح کی دوبارہ آمد۔

آس حد تک میں نے مسیحی اساسیئن کے نظریہ کی تشریح کی ہے۔ اور ان کی پوری تاریخ بھی بیان کر دی۔ ۱۸۷۰ء کے آس پاس مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جو مہدی اور مسیح کے آمد کے منتظر تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح مہدی کے بغیر ناممکن ہے۔ اور مہدی کے بعد مسیح کا آنا بھی ضروری ہے۔

سوڈان میں محمد احمد (۱۸۴۴ء تا ۱۸۸۵ء) نے مہدویت کا دعویٰ کیا مہدی سوڈانی نے بہت سی فتوحات حاصل کیں مگر ۱۸۸۵ء میں مہدی سوڈانی کا انتقال ہوگیا۔

ہندوستان میں مرزا غلام احمد قادیانی نے ۱۸۳۹ء تا ۱۹۰۸ء میں مہدی اور مسیح ہونے کا دعویٰ کیا۔ مرزا صاحب کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح مہدی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مگر جب انھوں نے یہ دیکھا کہ مہدی کے بعد مسیح کا آنا بھی ضروری ہے تو انھوں نے مسیح ہونے کا بھی دعویٰ کیا۔ مگر کیونکہ مسیح علیہ السلام نبی تھے اس لئے انھوں نے نبوت کا بھی دعویٰ کیا۔ مسلمانوں نے انھیں ماننے سے انکار کر دیا اس لئے وہ ایک فرقہ بن کر رہ گئے جس طرح ۱۹۱۴ء میں یہ اساسیئن دو فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ اس طرح غلام احمد قادیانی کے انتقال کے بعد تقریباً ۱۹۱۴ء کے

لگ بھگ احمدی بھی دو فرقوں میں بٹ گئے۔ ایک فرقہ قادیانی تھا دوسرا لاہوری۔
مرزا غلام احمد قادیانی کو خود کو نبی قرار دیتے تھے جو سراسر کفر تھا۔ لیکن وہ بنیادی طور پر قرآن میں کسی ردوبدل کے قائل نہیں تھے۔ قرآن کو وحی الٰہی مانتے تھے اور معجزات کو بھی تسلیم کرتے تھے۔
ایران میں ۱۸۴۴ء میں مرزا علی محمد باب نے (۱۸۱۹ء تا ۱۸۵۰ء) امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ عیسائی اور مسلمان سب ایک عہد مبارک کا انتظار کر رہے تھے اس لئے مہدویت کے دعویٰ داروں کو بہت سے پیروکار مل گئے۔ باب کا انتقال ۱۸۵۰ء میں ہوا اور اس کے بعد ۱۸۶۳ء میں بابی تحریک دو حصوں میں بٹ گئی اور مرزا حسین علی نے یہ دعویٰ کیا کہ جس موعود شخصیت کا باب نے دعویٰ کیا تھا وہ میں ہوں۔ وہ خود کو اللہ کا مظہر کہتا تھا۔ لوگوں نے سمجھا کہ شائد بہاء اللہ کے بعد کوئی مبارک دور شروع ہو جائے گا۔ لہٰذا بہاء اللہ کو بھی بہت سے پیروکار مل گئے لیکن نہ تو مہدی سوڈانی کے بعد نہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بعد نہ باب اور بہاء اللہ کے بعد کوئی مبارک دور شروع ہوا۔ اگر مسلمانوں میں کوئی لوگوں پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے تو وہ یہی چند فرقے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ سارے شیعہ اور سنی راسخ العقیدہ مسلمان ہمیشہ ان فرقوں کے مخالف رہے ہیں۔
لفظ اساسیین کا اطلاق آج کل بعض مسلمان جماعتوں پر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جماعت اسلامی، الاخوان المسلمون، ایرانی انقلاب کے حامی وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس لفظ کو اساسیات دین کے معنی میں لیا جائے تو میرا خیال ہے کہ کوئی لبرل سے لبرل مسلمان بھی اپنے آپ کو اساسیاتِ دین کا منکر نہ قرار دے گا۔ اور اگر کوئی مسلمان اساسیات دین ہی سے انکار کر بیٹھے تو غالباً انتہائی آزاد خیال مسلمان بھی اسے مسلم قوم کا فرد ماننے کے باوجود اس کی تحریروں کو کوئی وزن نہ دے گا۔
مسیحیوں نے "اساسیات" FUNDAMENTALS کے نام سے کچھ

رسالے شائع کئے تھے جن کی وجہ سے انھیں اساسیین یعنی FUNDAMENTALISTS کہا جانے لگا۔ ان رسالوں میں مسیحیت کے بنیادی عقائد بیان کئے گئے تھے اور ان کی نئی تعبیر کو غلط ثابت کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے ہر مسیحی جو ان رسالوں سے متفق تھا اسے FUNDAMENTALIST کہا جا سکتا ہے۔ مگر جن لوگوں کو اساسیت پسند کہا جا سکتا ہے جو انیسویں صدی میں مہدی اور مسیح کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دین میں جن چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے انھیں دین سے خارج کر دیا جائے اور اسلام کو اس کی اصل بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ مگر اس سلسلے میں بھی مختلف لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ بعض ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو دین میں اضافے کو صحیح سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان لوگوں کو راسخ العقیدہ شمار کیا جاتا ہے۔ اہل قرآن کے نام سے ایک گروہ مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ جو باتیں صرف قرآن میں پائی جاتی ہیں انھیں پر دین کی عمارت استوار ہونی چاہئے۔ مگر اس گروہ کو دین سے منحرف قرار دیا جاتا ہے۔ سر سید احمد خاں نے دین کو صرف اصل بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی مگر راسخ العقیدہ علماء نے انھیں گمراہ ٹھہرایا مگر بعد میں جب انھوں نے اپنے عقائد پر زور نہیں دیا تو امت نے انھیں مان لیا۔

آج بھی جتنے متجدد مسلمان اصلاح کے مدعی ہیں وہ محض قرآنی بنیادوں پر دین کی تشریح کرنا چاہتے ہیں بعد میں جو احادیث جمع کی گئی ہیں۔ ائمہ فقہ و حدیث نے ان کی جو تشریحات کی ہیں ان کی طرف وہ زیادہ توجہ نہیں دیتے وہ محض ابتدائی اسلام کی طرف مراجعت کرنا چاہتے ہیں مگر یہ لوگ آزاد خیال سمجھے جاتے ہیں لہٰذا آزاد خیال لوگوں کو فنڈامنٹلسٹ قرار دیا جانا چاہئے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دین کی لفظی تشریح کرنے والوں کو اساسیت پسند کہا جانا چاہئے مگر اس گروہ میں نہ جماعت اسلامی آتی ہے اور نہ اخوان المسلمون اور نہ

ایرانی انقلاب کے حامی۔

امام خمینی نے امام مہدی کے عدم ظہور کے باوجود اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے حکومت اسلامی نام کی ایک کتاب لکھی ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ پرانا شیعی نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی نظام اس دور میں بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا امام خمینی کے حامیوں کو فنڈامنٹلسٹ نہیں کہا جاسکتا۔

جماعت اسلامی کی بنیاد مولانا مودودیؒ نے ڈالی تھی۔ جو لوگ راسخ العقیدہ سمجھے جاتے ہیں انھوں نے مولانا مودودی کی بعض تشریحات پر اعتراضات کئے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ان اعتراضات میں کوئی وزن ہے یا نہیں ان اعتراضات کے پیش نظر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کو فنڈامنٹلسٹ کس طرح قرار دیا جاتا ہے۔ مولانا مودودی نے سبع سماوات کی نئی تعبیر کی ہے۔ حالانکہ پرانے علماء سات آسمانوں کو ٹھوس مادہ سے بنے ہوئے تعبیر کرتے تھے۔ عرش کی تعبیر مولانا مودودیؒ نے اقتدار سے کی ہے حالانکہ پرانے علماء اس کی یہ تعبیر نہ کرتے تھے۔

الاخوان المسلمون کی بنیاد حسن البنّا نے ڈالی تھی۔ مگر اس زمانے میں حسن البنّاء صرف دینی اصلاح کے کام کر رہے تھے اور الاخوان المسلمون بھی صرف مسلمانوں کی اصلاح کے کام میں مصروف رہی ایک وقت آیا کہ کرنل ناصر الاخوان المسلمون کے ساتھ ملکر انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے اس دور میں کرنل ناصر اور الاخوان المسلمون ایک ہی نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ لہٰذا کرنل ناصر کو بھی فنڈامنٹلسٹ کہا جانا چاہئے۔ انقلاب کے بعد الاخوان المسلمون کے سب سے بڑے مفکر سید قطبؒ تھے اور سید قطبؒ مولانا مودودی کی فکر سے بے حد متاثر تھے۔ بہرحال انھوں نے قدیم علماء کی روش سے ہٹ کر اسلام کی ایک نئی تعبیر کی۔ اپنی کتاب العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام میں انھوں نے کہا ہے کہ ابوبکرؓ نے لوگوں میں مال غنیمت کو مساوی طور پر تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تھا لہٰذا ان کے زمانے تک معاشی مساوات باقی رہی۔ مگر حضرت عمرؓ نے پہلے اسلام

زیادہ حصہ دیا اور بعد میں اسلام لانے والوں کو کم حصہ دیا۔ اس کی وجہ سے معاشی عدم مساوات پیدا ہوگئی۔ سید قطبؒ نے لفظی تشریح پر اکتفا نہ کیا۔ اس لئے الاخوان المسلمون کو بھی فنڈامنٹلسٹ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جو لوگ مذہب پر نہایت سختی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں انھیں فنڈامنٹلسٹ کہا جانا چاہئے۔ دین پر سختی کے ساتھ جمے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ پرانی روایات پر سختی کے ساتھ جما رہنا چاہئے۔ حالانکہ اس دور کی جن جماعتوں کو فنڈا منٹلسٹ کہا جاتا ہے وہ سب علامہ اقبال، محمد عبدہ، ڈاکٹر علی شریعتی اور جمال الدین افغانی کے نظریات پر بڑی شدت کے ساتھ جمی ہوئی ہیں۔ کیا ان سب کو فنڈامنٹلسٹ کہا جائے گا۔ علامہ اقبال، علی شریعتی، محمد عبدہ نے دین کی نئی تعبیر پیش کی ہے۔ سید قطب پرانے لباس کو چھوڑ کر جدید لباس پہنتے تھے۔ ڈاکٹر علی شریعتی بھی جدید لباس پہنتے تھے جماعت اسلامی کے جدید تعلیم یافتہ اصحاب بھی جدید لباس پہنتے ہیں ان میں جماعت کے مجلس شوریٰ کے ارکان بھی ہیں۔ سید قطبؒ اور امام خمینی عورت کے چہرے کو چھپانا ضروری نہیں سمجھتے اور جماعت اسلامی میں بعض ارکان کا بھی یہی خیال ہے۔ الاخوان المسلمون کے نزدیک ڈاڑھی رکھنا ضروری نہیں ہے۔ سید قطب ڈاڑھی نہیں رکھتے تھے۔ مولانا مودودیؒ نے ایک بار یہ کہہ دیا تھا کہ ڈاڑھی کی کوئی مقدار نہیں ہے۔ یہ غالباً ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ اس پر راسخ العقیدہ علماء نے سخت اعتراضات کئے تھے۔ امام خمینی نے علی رجائی کو وزیر اعظم بنایا تھا اور وہ بھی جدید لباس پہنتے تھے۔

اگر روایت پرست مسلمانوں کو فنڈامنٹلسٹ کہا جائے تو یہ مسلمان اس دور میں انقلاب کے علمبردار نہیں ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں روایت کے ماننے والے دو گروپ میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک گروپ دیوبندی ہے اور دوسرا بریلوی مگر دونوں گروپ اپنے عقائد میں اختلاف کے باوجود جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون دونوں کی مخالفت میں متحد ہیں اور ایرانی انقلاب کے بھی عام طور پر حامی نہیں ہیں۔

خود وہابی مسلمان جن کی حکومت سعودی عرب میں ہے وہ بھی ایرانی انقلاب کے ہم نوا نہیں ہیں۔ جماعت اسلامی ملوکیت کو غلط سمجھتی ہے اس لئے وہ سعودی حکومت کو اسلامی حکومت نہیں بتاتی۔ روایت پرست شیعہ عام طور پر امام خمینی کے مخالف ہیں۔ عام طور سے روایت کے ماننے والے علماء اپنی حکومت کے وفادار ہیں۔

آج جو لوگ مسلم فنڈ امنٹلزم کی اصطلاح سے نہایت خوف زدہ ہیں ان کی خوف کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جن تحریکوں کو اسلامی فنڈ امنٹلسٹ تحریک کہا جاتا ہے ان تحریکوں میں مسلم قوم کے دانشور پائے جاتے ہیں۔ جو اسلام کے اوپر مکمل اعتماد رکھتے ہیں وہ خلافت راشدہ کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کو اس دور میں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر خلافت راشدہ کے طریقۂ انتخاب میں اس دور میں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ امام خمینی نے ایران میں باقاعدہ جمہوریت قائم کی ہے جس میں ممبران پارلیمنٹ کا باقاعدہ انتخاب ہوتا ہے۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی ایک نیا سماجی سیاسی اور معاشی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ نظام اس دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے روبہ عمل لایا جائے گا۔

مولانا مودودیؒ سے کسی نے پوچھا تھا کہ اسلامی نظام کس طرح وجود میں آسکتا ہے تو مولاناؒ نے جواب دیا تھا کہ صرف جمہوری ذرائع سے۔ اسی لئے پاکستانی جماعت اسلامی ضیاء الحق کی تائید نہیں کر رہی ہے حالانکہ ضیاء الحق نظام مصطفیٰ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر جماعت کے لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اس انقلاب کے بعد کوئی دوسرا انقلاب نظام اسلامی کو درہم برہم کر سکتا ہے۔

الاخوان المسلمون شام میں جمہوریت کی بحالی کے لئے کوشش کر رہی ہے۔ کیوں کہ اسد خود کو جمہوریت کا حامی بتاتے ہیں۔ مصر میں الاخوان المسلمون جمہوریت کی بحالی کے لئے پریشان ہیں کیونکہ مصری حکمران خود کو جمہوریت کا حامی بتاتے ہیں سعودی عرب میں کیونکہ ملوکیت ہے اور الاخوان کی تعداد بہت کم ہے اس لئے وہ کھل کر سامنے نہیں آتے ہیں۔ مصر اور شام ہی میں الاخوان کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ اگر یہ پارٹیاں

برسر اقتدار آگئیں تو ان دونوں ممالک میں جمہوریت قائم ہوجائے گی مگر چونکہ عوام الناس اسلام پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں اس لئے جمہوریت کی اسلامی شکل قائم کی جائیگی۔

ان جماعتوں میں مسلم دانشوروں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ لہٰذا لبرل مسلمانوں کو ان جماعتوں کی تائید کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ان جماعتوں کو عوام اچھا سمجھتے ہیں یا کم از کم انھیں برا نہیں خیال کرتے۔ انہی جماعتوں کی وجہ سے اسلام کی ایک نئی تعبیر وجود میں آسکتی ہے۔ ان میں سے بیشتر جماعتوں کے سربراہ اور دانشور اپنا شجرہ نسب علامہ اقبالؒ، محمد عبدہ اور ڈاکٹر علی شریعتی اور جمال الدین افغانی سے جوڑتے ہیں۔

مسیحی اساسیین نظریہ ارتقا کو غلط سمجھتے تھے انھوں نے TENNESSE میں اس کے خلاف ایک قانون بھی بنوادیا تھا۔ مولانا مودودیؒ نے بھی نظریہ ارتقاء کو غلط ثابت کیا ہے۔ مگر علامہ اقبال نظریہ ارتقار کو صحیح سمجھتے ہیں اس کے ساتھ مولانا مودودیؒ اقبال کو نہایت عظیم اسلامی مفکر بھی مانتے ہیں۔ جماعت اسلامی میں بعض لوگ نظریۂ ارتقاء کو صحیح سمجھتے ہیں اور بعض لوگ اسے غلط سمجھتے ہیں۔ اگر سعودی عرب یا کسی دوسرے ملک میں نظریہ ارتقار نہیں پڑھایا جاتا تو ان ممالک میں الاخوان یا جماعت اسلامی کی حکومت نہیں ہے۔

کمیونزم کی مخالف ساری جماعتیں ہیں۔ مگر یہ جماعتیں کمیونزم کے لادینی فلسفہ کی مخالف ہیں جس میں مادہ ہی اصل شئے ہے اور خدا کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔ مگر قومی ملکیت کو ماننے والے ان جماعتوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال زمین کو اللہ کی ملکیت قرار دیتے ہیں نہ کی انسان کی۔ ان جماعتوں نے کبھی نظریہ ارتقاء کو اپنا موضوع بحث نہیں بنایا۔ جس طرح مسیح اساسیین کے لئے نظریہ ارتقاء کی مخالفت ہی ایک نکتۂ اتحاد بن گیا تھا۔ اور اسی طرح کمیونزم کے معاشی نظام کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کمیونزم کے خلاف جو نکتہ اتحاد ہے وہ کارل مارکس کی خدا بیزاری ہے۔

اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ الاخوان ۔ جماعت اسلامی اور ایرانی انقلاب کے حامیوں کو کسی معنی میں بھی فنڈامنٹلسٹ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے اگر کسی گروہ کو ظلمت پسند (OBSCURANTIST) رجعت پسند (REACTIONARY) اور جامد (RIGID) قرار دینا ہو تو فنڈامنٹلسٹ کا لفظ اس گروہ کے اوپر چسپاں کیا جا سکتا ہے ۔ جس کی وجہ سے اس کی حیثیت گر جائے گی ۔

صدر ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

مولانا صدر الدین اصلاحی

کی بعض اہم تصانیف

اسلام اور اجتماعیت اسلام میں اجتماعیت کی کیا اہمیت ہے ؟ ملی انتشار کے کیا نقصانات ہیں ؟ نظم اجتماعیت کے بغیر دینی زندگی کس طرح ادھوری رہ جاتی ہے اور مطلوبہ اجتماعیت کس طرح وجود میں آتی ہے ؟ یہی ہیں وہ اہم موضوعات جن سے اس عالمانہ کتاب میں بحث کی گئی ہے ۔ قیمت : ۵ روپے

قرآن مجید کا تعارف اس کتاب میں مولانا محترم نے قرآن مجید کے نزول اس کی تدوین، اس کے کتاب الٰہی ہونے کے دلائل اور اس کی اہم اصطلاحات پر علمی انداز میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے ۔ قیمت : ۳ روپے

حقیقت نفاق قرآن مجید نے شرک اور کفر کے ساتھ نفاق سے بھی بحث کی ہے ۔ پہلے دونوں موضوعات پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن نفاق کے موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے ۔ مولانا محترم کی یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرتی ہے ۔ قیمت 4-25

ملنے کا پتہ :

مرکزی مکتبہ اسلامی ۔ دہلی ۶

خانۂ کعبہ اور عربوں کا مذہب

ولیم میور کے خیالات کا جائزہ

ڈاکٹر محمد ذکی

مستشرقین نے سیرت اور تاریخ اسلام پر جو علمی سرمایہ مہیا کر دیا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب کوئی اسلام سے متعلق کسی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو اس کے لئے ان کی تصانیف سے استفادہ یا تعرض کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ انھوں نے تحقیق و تنقید کے کچھ خاص اصول وضع کئے ہیں اور اس ضمن میں واقعات کے ساتھ ساتھ واقعہ نگار کے پس منظر کو بھی ذہن میں رکھنے پر زور دیا ہے۔ ان کے نظریات نے مشرق کے علمی حلقوں کو بھی بہت متاثر کیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اہل مغرب نے سیرت اور اسلام پر جو کچھ لکھا ہے اس کا تحقیقی جائزہ لیا جائے۔ زیر نظر مقالہ اسی سلسلہ کی ایک کوشش ہے۔

ولیم میور (WILLIAM MUIR) کا شمار صف اول کے مستشرقین میں ہوتا ہے۔ موصوف نے سیرت پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے، جس میں ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے۔ مقدمہ کے تیسرے باب میں مصنف نے بنائے کعبہ اور ضمناً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے متعلق روایات پر بحث کی ہے۔ ذیل میں ہم اسی کا جائزہ ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

تحقیق طلب امور چونکہ بحث طویل ہے اور بہت سے متنازع فیہ مسائل اس میں آ گئے ہیں اس لئے ان کی تنقیح ضروری

ہے تاکہ بنیادی مسائل حل ہو جائیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا تحقیق طلب مسئلہ یہ ہے کہ کعبہ کی ابتدا کیسے ہوئی، اس کا بانی کون تھا اور اس سے متعلق عقائد و رسوم کی اصل کیا ہے؟

دوسرا متنازع فیہ مسئلہ یہ ہے کہ کعبہ اور مکہ کے مذاہب کا ابراہیم علیہ السلام سے کیا تعلق ہے؟ اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور تحقیق طلب ہیں۔

(۱) کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کبھی مکہ آئے تھے اور حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیل علیہ السلام کو وہاں بسایا تھا؟ اگر آئے تھے تو ان سے منسوب باتوں کی اصل کیا ہے یعنی کیا انھوں نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کی، کیا حج وغیرہ کے مناسک مقرر کئے اور مقرر کئے تھے تو وہ کیا تھے؟ کیا انھوں نے حضرت اسماعیل کو قربان کرنا چاہا تھا وغیرہ وغیرہ؟

(۲) اگر حضرت ابراہیم مکہ نہیں آئے تھے تو مذکورہ بالا باتیں ان کی طرف کب اور کیوں منسوب کی گئیں۔

بنائے کعبہ قرآن و حدیث کی روشنی میں

سب سے پہلے کعبہ کب اور کس نے تعمیر کیا؟ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیات سے مدد ملتی ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ	بیشک سب سے پہلا گھر جو (عبادت
لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ	کے مقصد سے) لوگوں کے لئے تعمیر
مُبٰرَکًا وَّھُدًی	ہوا وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔
لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝	(آل عمران ۹۶)

اگر الفاظ کو عام رکھا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی عبادت کے لئے سب سے پہلے جو گھر تعمیر ہوا تھا وہ یہی ہے جو بیت اللہ یا کعبہ کے نام سے مشہور ہے اسے قرآن حکیم میں "بیت العتیق"[1]، یعنی قدیم گھر بھی کہا گیا ہے۔ (الحج، ۲۹) اس مفہوم کی تائید اس

---

[1] ایک حدیث میں اس کی وجہ تسمیہ مذکور ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا:
روئے زمین پر پہلی مسجد کون سی تعمیر ہوئی، ارشاد فرمایا، مسجد حرام[۱]
ابن کثیر نے ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے وہ اس مفہوم کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:
کعبۃ اللہ کے پہلے بانی یہی (آدمؑ) تھے۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ عرش الٰہی کے محاذ میں زمین پر وہ بیت اللہ کی تعمیر کریں اور جس طرح انھوں نے ملائکۃ اللہ کو عرش الٰہی کا طواف کرتے دیکھا ہے اسی طرح خود اس کا طواف کریں[۲]
بہرحال محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے کعبہ کی تعمیر ہو چکی تھی۔ امتداد زمانہ کے سبب اس کی عمارت گرتی رہی اور بنتی رہی۔ حضرت ابراہیم کے زمانے میں اس کی صرف بنیادیں باقی رہ گئی تھیں انہی پر انھوں نے دیواریں اٹھائیں

کیا حضرت ابراہیم مکہ آئے تھے؟

جہاں تک حضرت ابراہیم کی مکہ میں آمد کا تعلق ہے تو عربوں میں ظہور اسلام سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے سے یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ حضرت ابراہیم مکہ آئے تھے، اپنی زوجہ حضرت ہاجرہؓ اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو مکہ میں بسا کر چلے گئے تھے اور بعد میں آ کر خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تھی جب اسلام ظاہر ہوا تو قرآن و حدیث نے اس کی تصدیق کی[۳]

روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا "بیت اللہ شریف کا نام عتیق اس لئے ہوا کہ اس پر کسی زبردست کا قبضہ نہ چلا"۔ اسی مفہوم کو ترجیح دی جائے گی لیکن اس کا ایک وصف قدیم ہونا ہے اس لئے یہ معنی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں۔ دیکھئے لغات القرآن "عتیق"۔

[۱] عارضۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی، ج ۱۲ ص ۳۰ از حافظ ابوبکر بن العربی (لغات القرآن ایضاً)

[۲] البدایۃ والنہایۃ، ج ۱ ص ۹۲ (مولانا بدر عالم، ترجمان السنۃ، ج ۳ ص ۴۶۲)

[۳] مثلاً سورہ البقرہ، ۱۲۵-۱۲۹، آل عمران، ۹۶-۹۷، ابراہیم، ۳۵-۳۷۔ الحج، ۲۶-۲۸۔ نیز بخاری کی ایک مشہور حدیث میں بھی اس کے اہم اجزاء نقل کئے گئے ہیں۔

البتہ عربوں نے حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے دین توحید میں شرک کی آمیزش کر دی تھی اور اور مناسک حج وغیرہ میں باطل رسوم داخل کر لی تھیں۔ قرآن و حدیث نے اس واقعہ کے صحیح خد و خال نمایاں کئے اور اسے باطل رسوم اور مشرکانہ عقائد سے پاک کیا۔

میور کی رائے میور اور دوسرے مستشرقین اس بات کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے کہ حضرت ابراہیم کبھی مکہ آئے تھے۔ اس لئے حضرت اسمٰعیل وہاں آباد بھی نہیں ہوئے۔

ہزاروں سال کی متواتر روایت کے مقابلے میں جب کہ قرآن و حدیث سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے یہ دعویٰ کرنا کہ اس واقعہ کی کوئی اصل نہیں بہت اہم بات ہے اور اس کے ثبوت کے لئے نہایت مستند تاریخی شہادت اور معقول دلائل کی ضرورت ہے۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں میور نے ایک بھی شہادت یا دلیل نہیں دی ہے۔ بہر حال اس مسئلہ پر جو موصوف نے لکھا ہے اس کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت ابراہیمؑ کی آمد کے سلسلے میں جو روایت مشہور ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میور نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

(۱) ضرورت اس بات کی ہے کہ کعبہ کی اصل اور مقامی مذہب کے بارے میں مزید تحقیق و تفتیش کی جائے۔

(۲) مسلمانوں کا عقیدہ ان دونوں کی ابتدا کو ابراہیمؑ سے منسوب کرتا ہے اور بعض رسوم کا رشتہ بائبل کے قصہ سے جوڑ دیتا ہے۔

(۳) یہ سب ایک افسانہ ہے (FABLE LEGEND) اس بات کا کوئی امکان ہی نہیں کہ مکہ اور اس کے مذہب کی ابتدا اس طرح ہوئی ہو (جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں) یہ ایک یقینی (طے شدہ) بات ہے۔ اس یقین کو مندرجہ ذیل امور سے تقویت پہنچتی ہے:

(ا) اس توہم پرستی میں کوئی بات بھی ایسی نہیں معلوم ہوتی جسے ابراہیمی کہا جاسکے۔ حجر اسود کو بوسہ دینا، کعبہ کا طواف، مکہ، عرفات اور منیٰ میں انجام دی جانے والی مختلف رسوم، بعض مہینوں کو حرام سمجھنا اور حرم کا احترام کرنا۔ ان تمام باتوں کا ابراہیم سے کوئی تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔

(ب) ان امور کا ان تصورات سے بھی کوئی تعلق سمجھ میں نہیں آتا جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے ابراہیمؑ کی نسل کو ورثہ میں ملے ہوں گے اور

(ج) جن اسباب نے ان رسوم کو جنم دیا ان کا اس علاقہ سے کوئی تعلق ہی نہیں جس میں اولاد ابراہیمؑ آباد تھی۔

میور کے بیان کردہ بعض نکات تشریح طلب ہیں۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو یہ حق ہر مورخ کو حاصل ہے کہ وہ مروجہ روایات کی چھان بین اور مزید تحقیق کرے لیکن مسلمانوں سے منسوب کرکے جو دو باتیں میور نے کہی ہیں ان کی وضاحت ضروری ہے۔

معلوم نہیں میور کو یہ غلط فہمی کس بنا پر ہوئی کہ مسلمانوں کے عقیدہ کی رو سے حضرت ابراہیمؑ کعبہ کے بانی ہیں۔ اس مسئلہ سے متعلق قرآن و حدیث کی تصریحات ہم ابھی اوپر نقل کر چکے ہیں جن سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں تک بنائے کعبہ کا تعلق ہے اسے ابراہیم علیہ السلام سے منسوب نہیں کیا جاسکتا نہ کیا گیا ہے۔ اگر میور کی غلط فہمی یہیں تک محدود ہوتی تو بہت زیادہ اہم نہ ہوتی لیکن موصوف نے اسی مفروضہ پر بحث کی عمارت کھڑی کر ڈالی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اصل موضوع تو الجھ گیا اور بحث نے غلط رخ اختیار کر لیا جیسا کہ آپ ابھی ملاحظہ فرمائیں گے۔

دوسری بات یہ کہی ہے کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ مقامی مذہب یعنی مکہ کے مذہب کے بانی بھی حضرت ابراہیمؑ ہیں لیکن موصوف نے یہ وضاحت نہیں کی کہ مقامی مذہب سے کون سا مذہب مراد ہے کیونکہ اس کی دو شکلیں ہو سکتی

تھیں۔ ایک تو مذہب توحید جس کی تعلیم بلاشبہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیل نے دی تھی اور مناسک حج وغیرہ مقرر کئے تھے۔ دوسری شکل وہ تھی جو ظہور اسلام کے وقت تھی یعنی شرک، بت پرستی، توہم پرستی اور جسے عرب ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی طرف منسوب کرتے تھے (جسے مسلمانوں نے کبھی صحیح نہیں سمجھا) اگر میور کا اشارہ پہلی صورت کی طرف ہے تو قابل اعتراض نہیں لیکن اگر اس سے مراد دوسری صورت ہے تو یہ مسلمانوں اور حضرت ابراہیمؑ پر صریح بہتان ہے۔ اب نہیں کہا جاسکتا میور نے کون سے انتساب کو افسانہ کہا ہے۔

اس کے بعد کی عبارت واضح ہے یعنی جب ابراہیم علیہ السلام مکہ آئے ہی نہیں تو پھر بیت اللہ کی تعمیر کا ان سے کیا تعلق اور جب انھوں نے خانہ کعبہ بنایا ہی نہیں تو پھر اس کا طواف بھی نہیں کیا اس لئے حج وغیرہ کا بھی ان سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ نیز ان کی اولاد نے بھی کبھی عمرہ یا طواف نہیں کیا۔ ان میں قربانی کی یادگار بھی نہیں، یہ لوگ (بنی اسرائیل) شام و فلسطین کے علاقہ میں آباد تھے وہاں نہ مکہ جیسی وادی ہے نہ کعبہ۔ حاصل کلام یہ کہ کعبہ اور اس سے متعلق جو رسوم مشہور و معروف چلی آرہی ہیں ان کا حضرت ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کی آمد کا انکار کرنے کے بعد یہ نتائج میور نے اخذ کئے ہیں اور یہی ہونے بھی چاہئیں۔

خانہ کعبہ کی اصل کے بارے میں میور کے "انکشافات"

حضرت ابراہیمؑ سے خانہ کعبہ کا رشتہ منقطع کرنے کے بعد میور نے یہ ذمہ داری بھی اپنے سر لی ہے کہ اب اس کا سرا کس سے جوڑا جائے۔

چونکہ میور کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ مسلمان حضرت ابراہیمؑ کو کعبہ کا بانی بتاتے ہیں اور اسے غلط ثابت کرنا ہے اس کے لئے میور نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ خلاصۂ استدلال:

(۱) مکہ کے اس مذہب کی جڑیں بہت قدیم زمانے میں پیوست ہونی چاہئیں اگرچہ ہیروڈوٹس اس کا ذکر نہیں کرتا لیکن عربوں کے مشہور دیوتا "اللات" کا تذکرہ کرتا ہے۔ یہ اس بات کی قوی شہادت ہے کہ اتنے قدیم زمانہ میں "لات" کی پوجا ہوتی تھی جو مکہ کا ایک بڑا بت تھا۔ وہ یہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ عرب پتھروں کا احترام کرتے ہیں۔

(۲) ڈایوڈورس سکولس نے ۵۰ ق م میں لکھا ہے کہ سرزمین عرب میں ایک معبد ہے جس کا عرب بہت احترام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس سے خانہ کعبہ مراد ہے۔

(۳) کوئی بھی تاریخی روایات نہیں بتاتیں کہ کعبہ سب سے پہلے کب تعمیر ہوا۔

(۴) بعض مصنفین کا کہنا ہے کہ عمالقہ نے اس کو دوبارہ بنایا تھا۔

(۵) اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جرہم (قبیلہ کا نام ہے) نے سنہ عیسوی کے لگ بھگ اس کی دوبارہ تعمیر کی تھی۔

(۶) روایت بتاتی ہے کہ نامعلوم زمانہ سے دور دراز سے عرب قبائل ہر سال مکہ آیا کرتے تھے۔

(۷) جو عقیدت اتنی عام ہو اس کی ابتدا بہت ہی زمانہ قدیم زمانہ میں ہو سکتی ہے اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ کا مذہب بہت ہی زیادہ قدیم ہوگا جس توہم پرستی کی جڑیں بہت دور ماضی میں پیوست ہوں اس کی ابتدا بھی اسی سرزمین میں ہو سکتی ہے نہ کہ کسی غیر ملک میں۔

کعبہ کی قدامت ثابت کرنے کا مقصد غالباً یہ ہے کہ مسلمانوں کے اس دعوے کی تردید کی جائے کہ ابراہیمؑ ہی اس کے بانی تھے اور ان سے پہلے کعبہ موجود نہیں تھا (اگرچہ یہ خیال ہی غلط ہے پھر بھی مان لیا جائے کہ ابراہیم علیہ السلام ہی اس کے بانی اول ہیں) اس کے لئے اگر ابراہیم علیہ السلام سے پہلے یعنی ۲۰۰۰ ق م کی کوئی مستند تاریخی شہادت ایسی مل جاتی ہے جو یہ ثابت کر دے کہ اس سے پہلے کعبہ موجود تھا تو گویا مسلمانوں کے قول

کی تردید ہو جائے گی۔ اب دیکھئے میور نے کتنی قدیم شہادت پیش کی ہے۔

بہت تلاش اور تاریخ کی ورق گردانی کرنے کے بعد ہیروڈوٹس پر نظر پڑی میور کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس یونانی مورخ کا زمانہ ۴۵۰ ق م (پانچ سو سال قبل مسیح) ہے لیکن جان بوجھ کر اس کا زمانہ نہیں لکھا تاکہ پڑھنے والا یہ سمجھے گویا یہ حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے کا مورخ ہے۔

پھر یہ بھی کعبہ کا حوالہ نہیں دیتا، "اللات" کا ذکر کرتا ہے جو طائف کا بت تھا نہ کہ مکہ کا۔ جب کچھ بس نہ چل سکا تو میور نے طائف کے دیوتا کو مکہ کا دیوتا بتا دیا تاکہ اس سے یہ گمان ہو جائے کہ جب مکہ کے اس بت کا ذکر کیا ہے تو یقیناً کعبہ بھی وہاں موجود ہوگا۔

سب سے زیادہ قدیم تاریخی شہادت جو کعبہ کے بارے میں دستیاب ہو سکی وہ حضرت مسیحؑ سے صرف پچاس سال پہلے کی ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام سے تقریباً ایک ہزار نو سو پچاس سال بعد کی۔ اور اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے موجود تھا۔ میور کی منطق آپ کی سمجھ میں آئی؟!

جب تاریخ ساتھ نہ دے سکی تو پھر میور نے مجبور ہو کر عربوں کی روایات کا سہارا لیا اور عمالقہ سے کعبہ کی تعمیر نو منسوب کر کے پھر یہی تاثر دینے کی کوشش کی گویا عمالقہ تو ابراہیم علیہ السلام سے پہلے تھے جب انھوں نے منہدم عمارت کو پھر سے بنایا تو وہ ان سے بھی پہلے موجود ہوگا۔ اور یہ بھی غالباً میور کے علم میں ہوگا کہ عمالقہ کا زمانہ حضرت ابراہیمؑ سے بہت بعد کا ہے[1]۔ یہاں بھی اس کی وضاحت بالقصد نہیں کی۔

اور آخر میں اپنا مرغوب "حربہ" استعمال کیا یعنی "ابہام"۔ "بہت قدیم" "انتہائی قدیم" کی تکرار کر کے نتیجہ نکال لیا کہ اس مذہب کی جڑیں سرزمین عرب میں پیوست ہیں یعنی کسی عرب نے ہی کعبہ بنایا ہوگا۔ غیر ملکی نہیں بنا سکتا۔

---

[1] دیکھئے لغات القرآن (ندوۃ المصنفین) "الکعبہ"

اگر اس ابھی ہوئی بحث کا کوئی مفہوم سمجھ بھی لیا جائے تو کیا اس سے یہ ثابت ہو گیا یا اس طرف اشارہ بھی ملا کہ ابراہیم علیہ السلام مکہ کبھی نہیں آئے اور وہ کعبہ جو ان سے پہلے موجود تھا اس کو از سر نو تعمیر نہیں کیا؟

تیسری اور اہم بات جسے میور نے گویا بطور دلیل پیش کیا ہے وہ یہ کہ عرب میں تین مقامی مذاہب کا رواج تھا۔ صابئی (کواکب پرستی) بت پرستی، اور حجر (پتھر) پرستی۔ ان تینوں کا مکہ کے مذاہب سے قریبی تعلق ہے۔ ان تینوں کے امتزاج نے کعبہ، طواف، قربانی وغیرہ کی شکل اختیار کر لی۔[1]

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ پُر فریب جملے، مغالطہ آمیز باتیں، الفاظ کی بازی گری، قیاس آرائیاں اور اٹکل کے تیروں سے دوسرے تو کیا ایسا کرنے والا بھی مطمئن نہیں ہو پاتا۔ ضمیر ایک ایسی چیز ہے کہ جس کا گلا آسانی سے نہیں گھونٹا جا سکتا اور اس کے لئے مسلسل اور سخت جد و جہد کرنا پڑتی ہے۔

بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا لینے کے بعد میور کے دل میں جو بات کھٹکی اس کا اظہار موصوف نے اس طرح کیا ہے:

اس نظریہ کے مطابق ہم عربوں کی اس روایت کی توجیہ کس طرح کریں جس میں کعبہ کا بانی حضرت ابراہیمؑ کو بتایا گیا ہے۔ یہ مسلمانوں کا گھڑا ہوا قصہ تو ہے نہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت پہلے سے یہ روایت مشہور تھی ورنہ قرآن میں اسے امر مسلمہ کی حیثیت سے کس طرح بیان کیا جاتا، نیز کعبہ کے نزدیک بعض مقامات

---

[1] یہاں میور نے ابن اسحاق کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بنی اسماعیل میں حجر پرستی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ کچھ لوگ حرم کعبہ سے کوئی پتھر لے گئے اور اس کو نصب کر کے اس کا طواف کرنے لگے۔ لیکن میور کی رائے یہ ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ پتھر پرستوں نے پتھر جمع کر کے کعبہ بنا لیا نہ کہ کعبہ کے عقیدت مندوں نے کعبہ کے احترام میں پتھر لے جانا شروع کئے اور انھیں پوجنے لگے۔ "مستند ہے میور کا فرمایا ہوا"

حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ سے کس طرح منسوب کر دیئے جاتے۔ اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ شروع میں ابراہیمی قبائل یمن کے قبائل میں گھل مل گئے اور ابراہیم و اسماعیل علیہم السلام کی نسل سے کوئی شاخ مکہ میں آباد ہوگئی اور جنوبی عرب کے یمنی قبائل میں خلط ملط ہوگئی۔ ان ابراہیمی قبائل میں اپنی قدیم روایات زندہ تھیں۔ قریب ہی (مدینہ، خیبر وغیرہ) میں یہود آباد ہوگئے۔ ان سے روابط قائم رہے روایات پارینہ تازہ ہوتی رہیں۔ مکہ کے یہ قبائل ایک طرف یمنی قبائل سے منسلک تھے دوسری طرف ابراہیمی شاخ سے بھی ان کا تعلق تھا۔ اس دہری اصل کو انھوں نے اس طرح محفوظ کیا کہ دونوں کی روایات کو ضم کرلیا یہودیوں سے ان کی روایات لیں اور معمولی سے ردو بدل کے بعد فلسطین کے قصہ کو مکہ پر چسپاں کر دیا۔ کعبہ کو ابراہیمؑ سے منسوب کر دیا اور فلسطین میں حضرت ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کے قصہ کو اٹھا کر مکہ کی وادی پر منطبق کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کی بت پرستی اور یہودیوں سے لی گئی توحید کے درمیان خلیج پُر ہوگئی۔ اور یہی وہ سنگم ہے جس پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی عمارت کھڑی کی۔

بحث ختم، دعویٰ ثابت، مقصد واضح، اسلام کا پس منظر معلوم، آئندہ ابواب کی تمہید۔ سب کام ہوگئے ——— اسلام یہودیوں کی دین۔ اب اور کیا چاہیئے آپ کو؟!

ہاں اگر آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھرا ہو کہ آخر یہ ابراہیمی اور اسمٰعیلی قبائل مکہ میں کب آباد ہوئے تاکہ آپ یہ جان سکیں کہ کعبہ کی تعمیر اور ابراہیم علیہ السلام سے انتساب کتنا پرانا قصہ ہے۔

اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آخر یہودی قبائل مدینہ کب آئے اور پھر یہ قصے مشہور ہوئے۔

اگر آپ اس کی وجہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہودی یہ ساری روایتیں اہل مکہ کو دیتے رہے اور خاموشی سے یہ کیوں دیکھتے رہے کہ ان کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام

کو کعبہ کے معاملے میں "ملوث" کیا جا رہا ہے؟

اگر آپ ان تمام باتوں کا تاریخی ثبوت چاہتے ہیں تو پھر میور کے مبہم جملوں میں تلاش کرتے رہئے۔ لیکن ان کا جواب میور کی بحث میں نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ ان باتوں کا جواب نہ میور کے پاس تھا، نہ اس سے پہلے کے مستشرقین کے پاس اور نہ موجودہ دور کے مستشرقین کے پاس۔

صحیح یا غلط واقعات کا پس منظر تو میور نے بیان کر ہی دیا۔ لیکن واقعہ نگار یا پس منظر بتانے والے کا پس منظر ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ آئیے اب اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

حضرت ابراہیم کی مکہ میں آمد کا انکار کیوں کیا جاتا ہے

آخر مستشرقین، چاہے یہودی ہوں یا عیسائی، اس روایت کا اتنی شدت کے ساتھ انکار کیوں کرتے ہیں؟ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عرب روایت کی تائید تورات سے نہیں ہوتی بلکہ بعض اعتبار سے تردید ہوتی ہے اور تورات ہی حضرت ابراہیمؑ کے لئے قدیم ترین ماخذ ہے اور یہود و نصاریٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مستند دستاویز۔

عرب روایت تورات کی نظر میں

تورات کے بیان کے مطابق جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیاسی سال تھی اس وقت ان کے حضرت ہاجرہؓ سے ایک بیٹا ہوا جس کا نام انھوں نے اسمٰعیل رکھا۔ پھر جب حضرت ابراہیمؑ کی عمر سو سال ہوئی تو حضرت سارہ سے بھی ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اسحٰق رکھا گیا۔ اس وقت حضرت اسمٰعیل کی عمر تقریباً چودہ سال تھی۔ آگے کا قصہ تورات کی زبانی سنئے۔

> "اور وہ لڑکا (یعنی اسحٰقؑ) بڑھا اور اس کا دودھ چھڑایا گیا اور اضحاق کے دودھ چھڑانے کے دن ابرہام نے بڑی ضیافت کی، اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابرہام سے ہوا تھا

ٹھٹھا مارتا ہے، تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا، پر ابرہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی۔ اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث بُرا نہ لگے، جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے تو اس کی بات مان کیوں کہ اضحاق سے تیری نسل کا نام چلے گا۔ اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کروں گا اس لئے کہ وہ تیری نسل ہے۔ تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالہ کر کے اسے رخصت کر دیا۔ سو وہ چلی گئی اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی۔ اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے مقابل ایک تیر کے پٹے پر دور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں۔ سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی اور چلا چلا کر رونے لگی۔ اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیوں کہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اس کی آواز سن لی ہے۔ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کیوں کہ میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا۔ اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لئے بیوی لی۔ (پیدائش، باب ۲۱، ۸-۲۱)

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہودی اور عیسائی مورخین کیوں عربوں کی قدیم روایات کا انکار کرتے ہیں یعنی اس لئے کہ تورات میں کہیں ذکر نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ گئے یا حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ کو مکہ میں بسایا۔ آپ نے مذکورہ بالا اقتباس میں دیکھ ہی لیا کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہؓ کے ساتھ نہیں گئے بلکہ گھر سے ہی رخصت کر دیا اور وہ اپنے بیٹے کے ساتھ بیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھریں اور فاران کے بیابان میں رہنے لگیں اور یہ دونوں مقامات مفسرین تورات فلسطین کے جنوبی حصہ میں بتاتے ہیں۔ دور دور تک کہیں بھی مکہ معظمہ، صفا و مروہ، زمزم، کعبہ، منیٰ اور عرفات کا ذکر نہیں اور مستشرقین کے نزدیک تورات قدیم اور مستند کتاب ہے۔ اس لئے اس کے مقابلہ میں عرب روایات تسلیم کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ بات آئی ہو کہ تورات میں اور دوسری کتابوں میں اہل کتاب نے تحریف کی ہے، اضافہ و کمی کی ہے، ردو بدل کیا ہے تو یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ کوئی بھی اپنی کتاب میں جسے وہ الہامی سمجھتا ہو، جب تک کوئی قوی داعیہ نہ پایا جائے آسانی سے تحریف کی جرأت نہیں کرتا۔

آیئے ذرا تورات کے بیانات کا تفصیلی جائزہ لیں ممکن ہے کچھ مزید انکشافات ہوں اور بعض دوسری باتیں بھی سمجھ میں آجائیں۔

تورات کی رائے حضرت ہاجرہ کے بارے میں

ابھی آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ تورات کے اس اردو ترجمہ میں حضرت ہاجرہؓ کو چار بار "لونڈی" کہا گیا ہے۔ انگریزی تراجم میں BOND-WOMAN کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو "لونڈی" کا ہم معنیٰ ہے۔ دوسرے انھیں مصری کہا گیا ہے، اور اسی کتاب کے باب ۱۶ میں انھیں حضرت سارہ کی لونڈی بتایا گیا ہے[1]

---

[1] لیکن انگریزی ترجمہ میں HANDMAID کیا گیا ہے جو BONDWOMAN سے ذرا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہؓ حضرت ابراہیمؑ کی پہلی زوجہ حضرت سارہؓ کی کی زرخرید لونڈی اور ان کی ملکیت تھیں اور یہ کہ انھیں مصر سے خریدا گیا ہوگا یا ان کا تعلق مصر سے تھا۔

حضرت ہاجرہؓ کے بارے میں تورات میں اور زیادہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کس طرح حضرت سارہ کی ملکیت میں آئیں اور ان کا تعلق مصر کے کس قبیلہ یا خاندان سے تھا لیکن یہودیوں کی دوسری روایات (تلمود) میں اتنا اور اضافہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور سارہؓ مصر گئے تھے تو وہاں کے بادشاہ، فرعون مصر، نے حضرت سارہؓ کی بزرگی سے متاثر ہوکر جہاں اور بہت سے تحائف دیئے تھے اپنی بیٹی حضرت ہاجرہؓ کو ان کی خدمت میں یہ کہکر

"میری بیٹی کا ایک ایسے گھر میں جس پر خدا کا خاص فضل وکرم ہو خادمہ بن کر (SERVANT) رہنا کہیں اور ملکہ بن کر رہنے سے بہتر ہے۔

حضرت سارہ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا[1]

انہی کو تورات میں جا بجا کبھی سارہ کبھی ابراہیم علیہ السلام کی لونڈی کہا گیا ہے اسی کتاب پیدائش کے ۱۶ ویں باب میں ایک اور واقعہ نقل کیا گیا ہے جو حضرت

ہلکا ہے کیونکہ اول الذکر کا ترجمہ خادمہ، کنیز اور لونڈی کیا جا سکتا ہے اور HAND MAID کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خادمہ تھیں ضروری نہیں کہ زرخرید لونڈی ہوں لیکن اردو ترجمہ میں دونوں جگہ لونڈی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

[1] ملاحظہ ہو: MYTH AND LEGEND OF ANCIENT ISRAEL: VOL. I P.257
قاضی سلیمان منصور پوری نے "رحمۃ اللعالمین" جلد ۲، صفحہ ۳۴ پر اسی سلسلہ میں لکھا ہے:
یہودیوں کی زبردست مفسر تورات ربی تنلوملو اسحٰق نے باب ۱۶ کتاب پیدائش تفسیر میں حضرت ہاجرہؓ کی بابت مندرجہ ذیل الفاظ تحریر کئے ہیں (ترجمہ عربی) وہ فرعون کی بیٹی تھی جب

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہاجرہؓ اور اسمٰعیل علیہ السلام بلکہ بنی اسمٰعیل کے کردار کا آئینہ دار ہے۔ اسے بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا اور ساری نے ابرام سے کہا دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے سو تو میری لونڈی کے پاس جا شائد اس سے میرا گھر آباد ہو اور ابرام نے ساری کی بات مانی۔ اور ابرام کو ملک کنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی ہاجرہ دی کہ اس کی بیوی بنے۔

(اقتباس طویل ہے لیکن ہم اس لئے نقل کر رہے ہیں تاکہ ہر واقعہ کا سیاق و سباق محفوظ رہے۔ باقی حصہ ملاحظہ فرمالیجئے۔)

اور وہ ہاجرہؓ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ حاملہ ہو گئی تو اپنی بی بی کو حقیر جاننے لگی۔ تب ساری نے ابرام سے کہا کہ جو مجھ پر ظلم ہوا وہ تیری گردن پر ہے۔ میں نے اپنی لونڈی تیرے آغوش میں دی اور اب جو اس نے آپ کو حاملہ دیکھا تو میں اس کی نظروں میں حقیر ہو گئی۔ سو خداوند میرے اور تیرے درمیان انصاف کرے۔ ابرام نے ساری سے کہا تیری لونڈی میرے ہاتھ میں ہے جو تجھے بھلا دکھائی دے سو اس کے ساتھ کر۔ تب ساری اس پر سختی کرنے لگی اور وہ اس کے پاس سے بھاگ گئی۔ اور وہ خداوند کے فرشتہ کو بیابان میں

اس نے کرامات کو دیکھا جو بوجہ سارہ واقع ہوئی تھیں تو کہا کہ میری بیٹی کا اس کے گھر میں خادمہ ہو کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے بہتر ہے۔

کرامات سے متعلق تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو توراۃ کتاب پیدائش ب۱۲، نیز ترجمان السنۃ ج۲ ص۲۵۹

پانی کے ایک چشمہ کے پاس ملی۔ یہ وہی چشمہ ہے جو شور کی راہ پر ہے۔ اور اس نے کہا اے ساری کی لونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی اور کدھر جاتی ہے؟ اس نے کہا میں اپنی بی بی ساری کے پاس سے بھاگ آئی ہوں۔ خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تو اپنی بی بی کے پاس لوٹ جا اور اپنے کو اس کے قبضہ میں کر دے۔ اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا یہاں تک کہ کثرت کے سبب اس کا شمار نہ ہو سکے گا۔ اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا۔ اس کا نام اسمٰعیل رکھنا اس لئے کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا۔ وہ گورخر کی طرح آزاد مرد ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا۔ اور ہاجرہ نے خداوند کا جس نے اس سے باتیں کیں اتا ایل روئی نام رکھا یعنی اے خدا تو بصیر ہے کیوں کہ اس نے کہا کیا میں نے یہاں بھی اپنے دیکھنے والے کو جاتے ہوئے دیکھا؟ اسی سبب سے اس کوئیں کا نام بیر لحی روئی پڑ گیا۔ وہ قادس اور برد کے درمیان ہے اور ابرام سے ہاجرہ کے ایک بیٹا ہوا اور ابرام نے اس بیٹے کا نام جو ہاجرہ سے پیدا ہوا اسمٰعیل رکھا۔ اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا[1]

---

[1] ان دونوں روایات کے سلسلے میں مفسرین توراۃ نے مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ دلائی ہے۔

(ا) ایک قدیم نسخہ میں صرف پہلی روایت ہے یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت سے پہلے حضرت ہاجرہ چلی گئی تھیں اور پھر واپس نہیں آئیں۔

(ب) بعض نسخوں میں دوسری روایت موجود نہیں ہے جس میں حضرت ہاجرہ کا نکالا جانا مذکور ہے۔

(ج) بعض لوگ دونوں واقعات کو ایک روایت کے دو روپ مانتے ہیں اس سے متعلق مزید بحث کے لئے ملاحظہ ہو INTERNATION CRITICAL COMMENTRY CH. 16 AND 21

یہ تفصیلات آپ کے سامنے ہیں اب آپ ان بیانات کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔

مصر کی شہزادی "لونڈی" کس طرح بن گئی

اس سلسلہ میں پہلا سوال جو ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ کہ مصر جیسے عظیم ملک کے فرماں روا (فرعون) کی بیٹی حضرت سارہ کی "لونڈی" کس طرح بن گئی۔ کیا فرعون مصر نے اپنی بیٹی کو حضرت سارہ کے ہاتھ فروخت کیا تھا؟ کیا ایک باپ اپنی بیٹی کو کسی کی غلامی میں دیا کرتا یا دے سکتا ہے؟ کیا حضرت سارہ نے خریدا تھا؟ اگر کوئی صورت بھی نہیں تو حضرت سارہ کو حضرت ہاجرہ پر مالکانہ حقوق کس طرح حاصل ہو گئے؟

ہاں ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز تحفہ میں دی جائے تو معاوضہ نہیں دیا جاتا لیکن یہاں صورت بالکل مختلف ہے۔ اگر فرعون مصر نے اپنی لونڈی تحفہ میں دی ہوتی تو بلاشبہ اس کی حیثیت لونڈی ہی کی رہتی۔ لیکن جب حضرت ہاجرہ لونڈی نہیں شہزادی تھیں تو خدمت میں دینے سے ان کی حیثیت لونڈی کی کس قاعدہ اور قانون کے تحت ہو گئی؟

ہر شخص جس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں وہ جاننا چاہے گا کہ اگر مصر کے فرماں روا نے حضرت سارہ کے تقدس اور حضرت ابراہیمؑ کی شانِ جلالت سے متاثر ہو کر عقیدت مندی میں اس بات کو قابل فخر سمجھا کہ اس کی بیٹی ایک جلیل القدر پیغمبر اور اس کی بیوی کی خدمت کرے تو اس میں غلامی کا تصور کہاں سے آگیا؟ کیا اس نے لونڈی بنا کر دیا تھا یا شہزادی کو خدمت کرنے کے لئے بھیجا تھا؟

کیا آپ کی سمجھ میں یہ منطق بھی آتی ہے کہ ایک شہزادی ایک نبی کی زوجہ کی خدمت کر رہی ہے۔ نبی کی زوجہ کو مالکانہ حق حاصل ہو گیا۔ اپنے شوہر کو اپنی "لونڈی" پیش کرتی ہے لونڈی رہنے کے لئے نہیں، داشتہ بننے کے لئے نہیں بیوی بننے کے لئے۔ اور بیوی بن جانے

لہ دیکھئے اوپر "بیوی" ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے، انگریزی ترجمہ میں WIFE ہے بطور CONCUBINE یا داشتہ نہیں۔

کے بعد بھی "آزادی" میسر نہیں آئی نہ حضرت ابراہیمؑ کا ان پر کوئی حق قائم ہو سکا بلکہ پھر بھی ملکیت حضرت سارہ کی قائم رہی اور انھیں پورا اختیار مل گیا کہ وہ جو چاہیں اس کے ساتھ کریں؛ ہم چاہیں گے کہ آپ ابھی کوئی فیصلہ نہ کریں، آگے بڑھیں لیکن اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ "تورات" لکھنے والوں نے مصر کی شہزادی کو لونڈی بنا کر پیش کیا ہے۔

حضرت ہاجرہ کے "نکلنے" اور "نکالے جانے" کے اسباب

موجودہ مطبوعہ توراۃ کے بیان کے مطابق

پہلی بار تو ہاجرہؓ خود ہی "بھاگ گئی" تھیں۔ اسباب کی کڑیاں اس طرح ملتی ہیں:

(۱) حضرت سارہ نے خود ہی یہ تجویز رکھی کہ حضرت ابراہیمؑ جناب ہاجرہؓ کو اپنے زوجیت میں لے لیں۔

(۲) جب حضرت ہاجرہ حاملہ ہوگئیں[1] تو حضرت سارہ کو حقیر سمجھنے لگیں۔

(۳) اس پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی زوجہ کو حضرت سارہ کی ملکیت میں دے دیا اس اختیار کے ساتھ "جو تجھے بھلا دکھائی دے سو اس کے ساتھ کر"۔ اور حضرت سارہؓ کو بھلائی۔ اس میں نظر آئی کہ انھوں نے (مصر کی شہزادی جو حاملہ تھی) اس کے ساتھ انتہائی سختی[2] کا برتاؤ کیا اور اسی بنا پر وہ گھر سے "فرار" ہوگئیں۔

---

[1] حالانکہ یہ بات کہ حاملہ ہو جانے کے بعد ان کا نظریہ حضرت سارہؓ کی طرف بدل گیا باب ۱۶ سے مستنبط ہوجاتا ہے کیونکہ "فرار" کے بعد فرشتہ نے بیابان میں انھیں بتایا کہ "تو حاملہ" ہے۔ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے انھیں اس سے پہلے اس کا علم نہیں تھا۔

بعض مفسرین توراۃ نے اسی بنا پر پہلی بات کو تو نہیں البتہ فرشتہ کے قول ۹-۱۰ کو "الحاق" بتایا ہے یعنی بعد میں کسی نے جوڑ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

THE INTERNATIONAL CRITICAL COMMENTARY – Vol I, J. SKINNER, P. 287

[2] مذکورہ بالا تفسیر میں یہی معنی دیئے ہیں:

"THE WORD SUGGESTS EXCESSIVE SEVERERITY" P. 286

اس بار تو فرشتہ نے واپس چلے جانے کا حکم دیا۔ آگے صراحت نہیں کہ وہ واپس آئیں یا نہیں لیکن بعد کے فقروں سے مطلب یہی سمجھا جا سکتا ہے وہ واپس آگئیں۔ اور بچہ کی ولادت کے بہت سال بعد نکالے جانے کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی بھی تفصیل ملاحظہ ہو:

(۱) اسی دوران حضرت سارہؓ کے بھی ایک بچہ (اسحٰق) پیدا ہو چکا ہے۔ حضرت اسحٰقؑ اس وقت قریب قریب تین سال کے ہیں۔ دودھ چھڑانے کی رسم ادا ہو رہی ہے اور ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

(۲) حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر اس وقت سترہ (۱۷) سال کے لگ بھگ ہے۔

(۳) ان سے اس موقعہ پر یہ "غلطی" سرزد ہو جاتی ہے کہ وہ "ٹھٹھا"[1] مار دیتے ہیں لیکن کس بات پر؟ یہ تورات کے متن میں نہیں

(۴) حضرت سارہؓ نے اسمٰعیل علیہ السلام کو "ٹھٹھے" مارتے ہوئے دیکھ لیا اور حضرت ابراہیمؑ پر زور ڈالا کہ "اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے" کیوں کہ یہ اسحٰق علیہ السلام کے ساتھ وارث نہ ہو جائے (یعنی ٹھٹھے کی بنا پر نہیں)

---

[1] اس فقرہ کا یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے کہ اسمٰعیلؑ اسحٰق کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔

(PLAYING WITH ISAC HER SON)

یعنی "یہ ایسا منظر ہے کہ دو چھوٹے بچے آپس میں مل کر کھیل رہے ہیں جو سماجی (اونچ نیچ کے) تصور سے ناآشنا ہیں۔ اس سے سارہ کا جذبۂ حسد بھڑک اٹھتا ہے اور ظالمانہ مطالبہ رکھ دیتی ہیں"۔

بعض مفسرین نے اسی لفظ سے "اقدام قتل" کا مفہوم بھی نکالا ہے۔ دیکھئے

INTERNATION CRITICAL COMMENTARY

صد ۲۲۲ وحاشیہ زیریں

اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اصل وجہ حضرت اسمٰعیلؑ کا ٹھٹھا مارنا نہیں، وہ اگر نہ بھی مارتے تو ایسا ہی ہوتا کیوں کہ اصل وجہ تو وراثت معلوم ہوتی ہے کیوں کہ حضرت اسمٰعیل پہلوٹھے تھے اور انھیں فضیلت حاصل تھی اس لئے حضرت سارہؓ نے یہی مناسب سمجھا کہ اس لڑکے کو راستہ سے ہٹا دیا جائے تاکہ تنہا حضرت اسحٰق ہی ابراہیم علیہ السلام کے وارث بن جائیں۔ معلوم نہیں یہ "ٹھٹھے" والا معاملہ یہاں کیوں "داخل" کر دیا گیا۔

بہرحال دوسری بار وراثت کے مسئلہ پر حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ دونوں کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھئے۔

نوجوان اسمٰعیل جو سترہ سال کے ہیں دودھائی سال کے بچے کی طرح نظر آتے ہیں

یہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا کہ اس "حادثہ" کے وقت حضرت اسمٰعیل کی عمر تقریباً سترہ سال ہے۔ ان کو اور ان کی والدہ کو گھر سے نکالا جا رہا ہے، لیکن کس طرح ملاحظہ فرمائیے، اور ذرا غور سے:

(۱) حضرت ابراہیمؑ نے روٹی اور پانی کی ایک مشک حضرت ہاجرہ کے کندھے پر رکھ دی

(۲) اردو ترجمہ میں تو یہ ہے کہ:

اور لڑکے کو بھی اس کے حوالہ کر کے اسے رخصت کر دیا

لیکن انگریزی ترجمہ اس سے ذرا مختلف ہے وہ اس طرح ہے:

"روٹی لی، اور پانی کی بوتل (BOTTLE) اور ہاجرہ کو دی، اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے، نیز بچہ کو، اور اسے رخصت کر دیا۔

اس ترجمہ میں حضرت اسمٰعیلؑ کے بارے میں وضاحت نہیں کہ کس طرح "حوالہ" کیا یعنی دونوں معنی مراد لئے جا سکتے ہیں، "انھیں بھی کندھے پر سوار کر دیا" یا ان کو بھی حوالہ کر دیا۔ دراصل تراجم میں یہ احتیاط اس لئے برتی جا رہی ہے کیوں کہ اصل الفاظ کا مفہوم کچھ اور ہے۔ اس جملہ کا صحیح ترجمہ اسکنر (SKINNER) کے نزدیک یہ ہے:

اور بچہ کو اس کے کندھے پر رکھ دیا[۱] یعنی بچہ کو بھی اس کی گود میں دے دیا۔ آپ

سمجھ گئے ؛ سترہ سال کے نوجوان "بچہ" کو ماں کی گود میں دے دیا ۔

(۳) "اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا"

جو پردہ اوپر کے ترجمہ میں "حوالہ" سے ڈالا تھا وہ یہاں اٹھتا نظر آرہا ہے ۔ جس کا مطلب یہ کہ پورے سفر کے دوران ماں سترہ سال کے نوجوان بچہ کو میلوں گود میں لادی پھری[۲] اور جب پانی ختم ہوگیا تو اسے گود سے اتار کر ایک جھاڑی کے نیچے لٹا دیا (جسے اردو ترجمہ میں "ڈال دیا" سے تعبیر کیا گیا ہے ۔)

(۴) اردو ترجمہ

اور چلا چلا کر رونے لگی ۔ اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی ۔

اس کا یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے :

اور بچہ چلا چلا کر رونے لگا[۳]

اردو ترجمہ میں تھوڑی "احتیاط" اس لیئے کی گئی ہے کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھنے لگے کہ سترہ سالہ نوجوان "بچہ" ایک جھاڑی کے نیچے پڑا رو رہا ہے ۔ لیکن عجیب بات ہے کہ چلا چلا کر تو ماں رو رہی ہے اور خدا آواز لڑکے کی سن رہا ہے !!

(۵) "اٹھ" اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال"

---

[۱] -AND THE BOY HE PLACED ON HER SHOULDER

THE INTERNATIONAL CRITICAL COMMENTARY

P.323

[۲] یہ ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے مذکورہ بالا تفسیر میں ہی لکھا ہے : دیکھ لیجئے

SHE CAST THE BOY (WHOM, THEREFORE, SHE MUST HAVE BEEN CARRYING)

[۳] AND THE BOY LIFTED UP HIS VOICE AND WEPT. - SKINNER - P.323

بظاہر سترہ سال کے نوجوان بچہ کو "اٹھا" اور ہاتھ سے سنبھال۔

یہ "سنبھال سنبھال" کر جملہ اس لئے کیا جا رہا ہے کہ کہیں کوئی اس پر "ٹھٹھے" نہ لگانے لگے کہ ایک معمر عورت سترہ سال کے بچہ کو گود میں لادے لادے پھر رہی ہے، کبھی جھاڑی کے نیچے لٹا دیتی ہے اور کبھی گود میں اٹھا لیتی ہے[1]

یہ ہے وہ واقعہ جس کو بقول میور عربوں نے یہودیوں سے لے کر مکہ پر چسپاں کر دیا۔ چسپاں ہوا یا نہیں یہ اب آپ دیکھ لیں۔

حضرت اسمٰعیل اہل تورات کی نظر میں

قطع نظر ان واقعات کے عام طور پر تورات کی حضرت اسمٰعیلؑ کے بارے میں کیا رائے ہے اور تمام تفصیلات دیکھ لینے کے بعد ان کے بارے میں کیا تاثر قائم ہوتا ہے، اس پر توجہ دیں۔

حضرت اسمٰعیلؑ کے بارے میں یہ چند خاص خاص باتیں کہی گئی ہیں!

(۱) ولادت سے پہلے فرشتہ نے حضرت ہاجرہ سے کہا تھا

میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا یہاں تک کہ کثرت کے سبب اس کا شمار نہ ہو سکے گا۔ (باب ۱۶: ۱۰)

(۲) خدا نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا:

اور اسمٰعیل کے حق میں بھی میں نے تیری دعا سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور

---

[1] یہ ہے تورات کا بیان جو مستند دستاویز سمجھی جاتی ہے۔ بائبل کے مختلف صحائف شروع میں کس زبان میں تھے، کن زبانوں میں کب تراجم ہوئے، قدیم اور جدید نظریات کی روشنی میں تورات اور دوسری کتابوں کے بیانات کہاں تک قابل استناد ہیں۔ ان میں ردوبدل یا تحریفات کا کہاں تک دخل رہا ہے۔ اہل کتاب نے اس سلسلہ میں تحقیقات کی ہیں۔ ممکن ہوا تو آئندہ اس کا خاکہ پیش کیا جائے گا انشاء اللہ۔

اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔ (پ ۱۷ ۲۰)

(۳) دوسرے موقع پر ابراہیم علیہ السلام کو تسلی دی گئی:

اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کروں گا اس لئے کہ وہ تیری نسل ہے۔ (پ ۲۱ ۱۳)

(۴) جب وہ فاران میں رہنے لگے تو

خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا (پ ۲۱ ۲۰)

وراثت سے محرومی

تورات نے حضرت اسمٰعیلؑ کو

(۱) حضرت ابراہیمؑ کا بیٹا بتایا ہے[1]

اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی تاکہ یہ خیال نہ ہو کہ "لونڈی" کی اولاد کا شمار بیٹوں میں نہیں ہوتا۔

(۲) حضرت اسمٰعیل بلاشبہ پہلوٹھے تھے۔ اس فضیلت کی بنا پر بھی یہ بات ظاہر تھی کہ وہی (روحانی طور پر) حضرت ابراہیمؑ کے وارث ہوں گے۔ اور اسی کی بنا پر حضرت سارہ نے (بقول تورات) ان کو راستہ سے ہٹایا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انھیں گھر سے نہ نکالا جاتا۔

(۳) حضرت سارہؓ کی اس فرمائش کی خدا نے بھی تائید کی، ابراہیمؑ کو خدا نے تسلی دیدی اور انھوں نے بھی حضرت سارہ کا مطالبہ پورا کر دیا۔ اس طرح یہ گھر جائداد سے بھی محروم ہو گئے اور ان روحانی برکتوں سے بھی جو حضرت ابراہیمؑ سے انھیں منتقل ہوتیں۔

(۴) اس محرومی کا سبب صرف یہ ہے کہ حضرت ہاجرہؓ نے حضرت سارہؓ کو "حقیر" سمجھا تھا اور ایک موقعہ پر حضرت اسمٰعیلؑ "ٹھٹھے" لگاتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ گویا ان ناقابل معافی اور تلافی خطاؤں" کے سبب حضرت سارہؓ برہم ہوئیں، خدا نے ان سے اتفاق فرمایا

---

[1] پیدائش پ ۱۶، پ ۱۱، پ ۲۵۔

ابراہیمؑ نے دروازہ سے باہر کر کے انھیں ویرانہ میں بھٹکنے کیلئے چھوڑ دیا ان کے لئے دروازہ بند ہو گیا اور حضرت اسحٰق کے لئے (برکتوں کا) دروازہ کھل گیا۔ اسی سلسلہ کی کچھ اور وضاحت سنئے۔ فرشتہ حضرت ہاجرہؑ سے پیدا ہونے والے اسمٰعیل کے بارے میں بتا رہا ہے:

وہ گورخر کی طرح آزاد مرد ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا۔ (پ ۱۶)

اس جملے کا ترجمہ اور بھی کئی طرح کیا گیا ہے۔ مثلاً

(۱) وہ ایک جنگلی آدمی ہوگا[1]

(۲) ایک آدمی کا جنگلی گدھا

(۳) نوع انسانی کا جنگلی گدھا[2]

اس کی وضاحت کرتے ہوئے ایک مفسر نے لکھا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسمٰعیل کی حیثیت لوگوں میں ایسی ہی ہوگی جیسے جانوروں میں جنگلی گدھے کی یہ ایک سرکش بدوی کے خصائل کی عمدہ عکاسی ہے جن کا ظہور اسمٰعیلؑ کی نسل میں ہونے والا تھا۔ اگلے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اسمٰعیل اپنے شہری بھائیوں کے لئے ایک تکلیف دہ پڑوسی رہے گا۔[3]

---

[1] انگریزی ترجمہ AND HE WILL BE A WILD MAN.

INTERNATIONAL CRITICAL COMMENTARY(P. 287)

—"A WILD ASS OF A MAN" OR PERHAPS 'THE WILD ASS OF HUMANITY"

[2] ایضاً ص ۲۸۷-۲۸۸۔ اس فقرہ کی اگر زیادہ تیز شرح دیکھنی ہو اور آپ ضبط سے کام لے سکیں تو بیٹ (Bate) کی AN EXAMINATION OF THE CLAIMS OF ISHMAIL p. 141—74 ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت اسمٰعیلؑ ـــ ایک ٹوٹا ہوا تارہ

اس کے بعد توراۃ میں حضرت اسمٰعیل کا کوئی ذکر نہیں اِلّا یہ کہ ضمناً کہیں کوئی حوالہ آگیا ہو۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ان کے حق میں جو "بشارتیں" دی گئیں تھیں وہ کس طرح پوری ہوئیں ایک مشک یا ایک بوتل پانی (جس میں ان کی والدہ بھی شریک تھیں)، اور چند روٹیاں (جو صرف ان کی والدہ نے کھائیں اور اگر یہ جوان تھے تو انھوں نے بھی کھائیں) اور نسل میں بارہ سردار وہ اس طرح کہ ان کے بارہ بیٹے ہوئے۔

اور یہی بارہ اپنے اپنے قبیلے کے سردار ہوئے۔ (۲۵:۱۶)

ان کا حساب گویا صاف ہوگیا۔ اس طرح "تورات" سے ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ اسمٰعیلؑ ایک ٹوٹا ہوا تارہ تھے جو آسمان نبوت سے ٹوٹا اور فضاؤں میں گم ہوگیا کیونکہ توراۃ اور بنی اسرائیل کی توجہ بنی اسمٰعیل سے ہٹ گئی۔ اور خدا کی ـــــ ساری نعمتیں بنی اسرائیل کے خانوادہ پر برستی رہیں۔

ظہور اسلام سے نظریات میں تلاطم

ساتویں صدی آئی۔ بنی اسمٰعیل سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان فرمایا۔ دنیا نے مخالفت کی، پھر سپر ڈال دی، اسلام پھیلا، سارے ملک عرب میں، قیصر و کسریٰ ٹکرائے، پاش پاش ہوگئے، یہ سیل رواں تھا جو کسی سے نہ رک سکا۔ بنی اسمٰعیل ایک زبردست قوم بن کر اٹھے اور اس وقت کی مہذب دنیا پر چھا گئے، تاریخ کی سب سے بڑی مملکت کے فرماں روا بن گئے۔ انسانوں کو انسانوں اور کائنات کی غلامی سے نجات دلائی اور دنیا نے ان کے کارناموں کا اعتراف کر لیا۔ بنی اسمٰعیل تعداد میں تاروں سے بڑھے یا نہیں لیکن آسمانِ دنیا کو انھوں نے ضرور منور کر دیا، مزین کر دیا، اور آج بھی کر رہے ہیں۔

ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل ـــ کیوں بن گیا؟

دنیا کی دوسری اقوام پر جو ردعمل ہوا سو ہوا لیکن بنی اسرائیل

پر کیا گزری؟

بنی اسمٰعیل نے ابتدائی دور میں بھی اور انتہائی عروج کے دور میں بھی اپنے بھائیوں — بنی اسرائیل کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن انھوں نے جھٹک دیا۔ اور اہل کتاب ہونے کے باوجود سب سے پہلے آپؐ کی نبوت کا انکار کیا حالانکہ جانتے تھے کہ یہ "وہ نبی" ہیں جن کی آمد کی خبر موسیٰ علیہ السلام دے چکے تھے اور بنی اسمٰعیل سے اٹھنے والے نبی کی اطاعت کا ان سے عہد لیا جا چکا تھا۔ یہ عہد اس وقت بھی یقیناً ان کے سامنے تھا جو آج بھی تورات میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے پوری قوم بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے تاکید کے ساتھ فرمایا تھا:

> خداوند اتیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔ (استثناء، ۱۸/۱۵)[1]

بنی اسرائیل کو تجربہ تھا کہ مصر میں حضرت موسیٰؑ نے جب اعلان نبوت کیا تھا تو ان پر کیا گزری تھی۔ بنی اسرائیل کو کیسے کیسے مصائب و مظالم کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ جانتے تھے کہ وہ ابتدائی دور بہت سخت تھا۔ انھیں اس کا بھی تجربہ تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کی تو ان کا تعاقب ہوا تھا اور پھر یہ دشمن ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے بعد پھر کوئی طاقت بنی اسرائیل کو نہ دبا سکی اور کامیابیوں کی راہیں کھل گئی تھیں۔ ہجرت کے بعد کا دور بہت آسانیوں کا دور تھا۔ بنی اسرائیل یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے بھائی بنی اسمٰعیل مکہ میں آباد ہیں۔ یہی وہ مرکز ہے جہاں سے "وہ نبی" اٹھے گا۔ اس کی مخالفت ہوگی، وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہجرت کرے گا اور پھر اس کے مخالفین کا زور بھی فرعون کی طرح ٹوٹے گا۔ تجربہ کار

---

[1] اس موقع پر خاکسار کا مضمون "وہ نبی۔ جس کا انتظار تھا" پہلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

بنی اسرائیل اس بار یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھے کہ مکہ میں آباد ہو کر مصر کے سے حالات سے دوچار ہوں، یہی وجہ ہے کہ یہ مدینہ (یثرب) میں آباد ہوئے تاکہ دیکھ لیں کہ "وہ نبی" اسی طرح آتا ہے، اسی طرح کامیاب ہوتا ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام ہوئے تھے۔ اور جب خطرے کے بادل چھٹ جائیں تو ہم بھی ساتھ ہولیں۔ اور جب وہ وقت آگیا تو صاف انکار کر دیا بلکہ قتل کی سازشیں کرنے لگے۔ اس کی وجہ ان کا حسد تھا۔ کہ

یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل کیوں بن گیا؟

ہمارے ذہن میں بھی کبھی کبھی یہ بات کھٹکا کرتی تھی کہ آخر اچھی طرح جان بوجھ کر اور خوب پہچان کر بھی بنی اسرائیل مخالفت پر کیوں آمادہ ہوئے؟ لیکن جب ہم نے دیکھا کہ تورات میں حضرت اسمٰعیلؑ کو حسد کی بنا پر کس طرح محروم وراثت کیا گیا، پھر جب ہم نے دیکھا کہ حضرت اسحٰقؑ کے دو بیٹوں عیسو اور یعقوبؑ کے درمیان یہ معاملہ آیا کہ عیسو پہلوٹھے ہونے کی وجہ سے حضرت اسحٰقؑ کی نعمتوں کے وارث ہوئے جاتے ہیں تو اس صورت حال کو بدلنے کے لئے ان سے منسوب ترکیب بھی تورات میں دیکھی تو سمجھ میں آیا:

(ہوا یہ کہ ایک دن عیسو بھوکے گھر لوٹے)

اور یعقوب نے دال پکائی اور عیسو جنگل سے آیا اور وہ بے دم ہو رہا تھا۔ اور عیسو نے یعقوب سے کہا یہ جو لال لال ہے مجھے کھلا دے کیونکہ میں بے دم ہو رہا ہوں.... تب یعقوب نے کہا تو آج اپنا پہلوٹھے کا حق میرے ہاتھ بیچ دے۔ عیسو نے کہا دیکھ میں تو مرا جاتا ہوں پہلوٹھے کا حق میرے کس کام آئے گا؟ تب یعقوب نے کہا کہ آج ہی مجھ سے قسم کھا۔ اس نے اس سے قسم کھائی اور اس نے اپنا پہلوٹھے کا حق یعقوب کے ہاتھ بیچ دیا۔ تب یعقوب نے عیسو کو روٹی اور مسور کی دال دی وہ کھا پی کر اٹھا اور چلا گیا۔ یوں عیسو نے اپنے پہلوٹھے کے حق کو ناچیز جانا۔

(پیدائش باب ۲۵ آیت ۲۹ تا ۳۴)

اس کے بعد حضرت اسحٰقؑ کا آخری وقت آنے لگا، وہ نابینا ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے بڑے بیٹے سے کہا کہ میرے لئے شکار کر اور عمدہ کھانا لا تو میں دعا دوں اور تجھ کو برکت دے دوں۔ بڑے بیٹے یعنی عیسو ہی کی ماں ربقہ نے سن لیا جو بڑے سے زیادہ چھوٹے بیٹے یعقوب کو چاہتی تھیں۔ انھوں نے جلدی سے یعقوب سے کہا کہ تو بکری کے دو بچے لا میں کھانا پکاتی ہوں، تو باپ کے سامنے لے جا اور خود کو عیسو بتانا اور اس طرح ساری برکتیں تجھے مل جائیں گی۔ مختصر یہ کہ یعقوب نے اپنا روپ عیسو کا بنا کر کھانا کھلایا اسحاقؑ نے دعا دی اور ساری برکتیں یعقوب کو مل گئیں۔ اتنے میں عیسو آئے۔ انھیں جب یہ قصہ معلوم ہوا تو اپنا سر پیٹ لیا۔ اور کہا اے باپ مجھے بھی برکت دے۔ باپ نے کہا۔

"تیرا بھائی دغا سے آیا اور تیری برکت لے گیا۔ تب اس نے (عیسو نے) کہا کیا اس کا نام یعقوب ٹھیک نہیں رکھا گیا۔ کیوں کہ اس نے دو بارہ مجھے اڑنگا مارا۔ اس نے میرا پہلوٹھے کا حق تو لے ہی لیا تھا اور دیکھ! اب وہ میری برکت بھی لے گیا۔ (پیدائش ۲۷: ۳۵-۳۶)

دروغ برگردن راوی، یوں خدا کی نعمتیں حضرت اسحٰقؑ سے گویا یعقوبؑ کو منتقل ہوئیں یعنی بنی اسرائیل کو۔

ہم نے چند ورق اور الٹے تو دیکھا یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں میں یہی جذبہ موجود ہے۔ وہ چھوٹے بیٹے یوسفؑ کو چاہتے ہیں اور دوسرے بیٹے اس کو گوارہ نہیں کرتے چنانچہ سب مل کر یہ طے کرتے ہیں

"آؤ اب ہم اسے مار ڈالیں اور کسی گڑھے میں ڈال دیں اور یہ کہہ دیں گے کہ کوئی درندہ اسے کھا گیا"۔ (۳۷: ۲۰) لیکن زندہ گڑھے میں ڈال دیا۔

پھر فیصلہ بدل کر یہ طے کیا کہ اسے بیچ ڈالیں۔

یہ سب باتیں پڑھ کر ہماری سمجھ میں آیا کہ جب انھیں اپنے بھائیوں ہی کا عروج گوارہ نہیں جو سب بنی اسرائیل ہیں وہ ذرا اوپر کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل کا عروج کس طرح گوارہ کریں گے۔ جو یوسفؑ کو قتل کرنے کے منصوبے بنائیں وہ بنی اسمٰعیل کے نبی کو زہر کیوں نہ دیں، اس پر پتھر گرا کر ہلاک کرنے کی سازش کیوں نہ کریں[1]

فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے تو چند روٹیوں اور پانی سے کام چل گیا اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اس طرح خدا کے فیصلے بدلے جا سکتے ہیں لیکن بنی اسمٰعیل کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے پر ان کی ساری ترکیبیں الٹ گئیں اور ان کی لاکھ مخالفانہ کوششوں کے باوجود "ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل بن ہی گیا"

بنی اسمٰعیل کا عروج دیکھ کر کڑھتے رہے اور پیچ و تاب کھاتے رہے کہ کیا کریں۔ بس کچھ چلا نہیں۔ بالآخر وہی کیا جو ایک شکست خوردہ اس ذہنیت کا آدمی کرتا ہے یعنی وقعت گھٹانا۔

"لونڈی"، "لونڈی بچہ" "ٹھٹھے" کا الزام، اور "گورخر" کہہ کر کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ یہ بھی کہا کہ "بنی اسمٰعیل" حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کی اولاد نہیں اور یہ "وہ نبی" نہیں۔

آخر میں ایک نکتہ کی طرف اشارہ کر دیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ کوئی قوم بھی آسانی سے گوارہ نہیں کرتی کہ وہ غیر قوم کی ممنون ہو اور غیر قوم کے ہیرو کو خراج عقیدت پیش کرے، اسے اپنا قومی ہیرو اور رہنما تسلیم کرے۔ ہر قوم کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہر قابل فخر بات اور کارنامہ کا سرا اپنے اسلاف سے جوڑ دے۔ لیکن تاریخ اسلام کا یہ بھی عجیب واقعہ ہے کہ عرب حضرت ابراہیمؑ کو اپنا مثالی رہنما بتاتے ہیں جو یقیناً غیر ملکی تھے، بلکہ عرب میں بسے بھی نہیں۔ دنیائے اسلام کے انتہائی

---

[1] یہ دونوں حربے استعمال کئے گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دیا گیا اور پتھر پھینکنے کا منصوبہ بھی بنایا گیا تھا۔ تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھئے، مشہور قصے ہیں۔

عظیم المرتبت روحانی مرکز کی تعمیر ان سے منسوب کرتے ہیں دین اسلام کا سہرا انہی کے سر باندھتے ہیں، ان کو قابل اتباع نمونہ مانتے ہیں، اس پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی کر سکتے تھے (اگر اسلام عربوں کی قومی مذہبی تحریک تھی جیسا کہ مستشرقین بتلاتے ہیں) کہ ان تمام کارناموں کا سہرا کسی عرب کے سر باندھ دیتے اور اپنی تاریخ کو "بیرونی" اثر سے آزاد کر لیتے۔ لیکن ان کا تو اصرار ہے کہ اے بنی اسرائیل، ہم تمہارے مورث اعلیٰ کے ممنون ہیں، ہم انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، عبادات اور مناسک حج میں ان کی پیروی کرتے ہیں، اُن کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔

لیکن بنی اسرائیل کو یہ گوارہ نہیں کہ ان کے مورث اعلیٰ کے سر یہ سہرا بندھے بلکہ یہ اصرار ہے کہ ان کا ان کارناموں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کا سارا کریڈٹ (Credit) تمہارے ہی اسلاف (عربوں) کو جاتا ہے۔

وہ لوگ جو ہر قابل فخر چیز، ہر نعمت اور برکت کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے میں پیش پیش رہے ہوں، اس معاملہ میں اتنے "فیاض" کیوں ہیں؟

وجہ ظاہر ہے۔ اگر یہ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام مکہ آئے تھے، خانہ کعبہ تعمیر کیا تھا، ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ کو بسایا تھا کہ ایک دن یہیں سے آفتاب رسالت طلوع ہوگا، اگر یہ تسلیم کر لیں کہ مذہب اسلام کا حضرت ابراہیمؑ سے گہرا تعلق ہے تو دنیا یہ نہ کہے گی کہ پھر تم اپنے مورث اعلیٰ کے مذہب سے کیوں روگردانی کرتے ہو جب کہ خود کو ان کی نسل سے فخریہ طور پر کہتے ہو اور ان کی پیروی کے بھی مدعی ہو اور ایسا حسد کی بنا پر کر نہیں سکتے اس لئے اسلام اور ابراہیم علیہ السلام کے درمیان اس قدیم اور تاریخی رشتہ کو کاٹنے کی کوشش میور، میور سے پہلے کے مستشرقین اور بعد کے مستشرقین کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ یہ ہے پس منظر نگاروں کا پس منظر۔

بحث ونظر

انسانی مساوات اور مذاہب عالم

سلطان احمد اصلاحی

انسانی سماج کو آزادی ومساوات سے ہمکنار کرنے کے سلسلے میں یورپ کی ناکامی ایک معلوم حقیقت ہے[1]۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس ذیل میں مذاہب کا کیا کردار رہا ہے؟ آج کی دنیا میں لادینی افکار ونظریات کو جیسا کچھ بھی فروغ حاصل ہے۔ تاہم اب بھی انسانی سماج پر مذہب کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ اور اپنے ماننے والوں کے قلب ودماغ پر اسے غیر معمولی اثر ورسوخ حاصل ہے اس لئے اس ضمن میں اس کے کردار پر گفتگو کی جانی ضروری ہے۔ اس کا افسوس ضرور ہے کہ لادینی افکار ونظریات کی طرح عام طور پر مذاہب عالم بھی انسانیت کو امن وسکون عطا کرنے سے قاصر ہیں۔ اور ان کے سائے تلے رہ کر انسان زندگی کی دوسری عزیز قدروں کی طرح عدل وانصاف اور آزادی ومساوات کی نعمت سے بھی محروم ہی رہتا ہے مذاہب کی یہ فہرست بہت طویل ہے۔ اس لئے ہم نمونے کے طور پر دنیا کے چار بڑے مذاہب کا تذکرہ کریں گے۔ ہندومت، یہودیت، بدھ مت اور عیسائیت۔ دوسرے مذاہب کو بھی انہی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو: تحقیقات اسلامی علی گڑھ کے شمارہ اول جنوری تا مارچ ۱۹۸۲ء میں راقم الحروف کا مضمون: "تصور مساوات کا پس منظر"

ہندومت

مذاہب عالم میں تاریخی اعتبار سے ہندومت سب سے قدیم ہے۔ اور ہمارا اس سے واسطہ بھی سب سے زیادہ براہ راست ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہم اسی کا جائزہ لیں گے کہ انسانی سماج کو آزادی و مساوات سے ہمکنار کرنے کے سلسلے میں اس کا کیا کردار رہا ہے؟ ہندومت کو آزادی و مساوات کی قدروں سے کیا نسبت ہے، اس کے سلسلے میں شائد اس سے بہتر کوئی مثال نہ ہو سکے کہ ان کے درمیان وہی نسبت ہے جو آگ اور پانی کے درمیان ہے، ہندو دھرم کا سارا نظام برہمنیت کے گرد گردش کرتا ہے جس کے اندر برہمن انسان ہوتے ہوئے بھی فوق الانسانی حقوق و اختیارات کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ جتنی بھی قومیں ہیں ان کا بس فریضہ منصبی یہ ہے کہ وہ مختلف حیثیتوں اور مختلف مراتب میں اس کی خدمت گذاری کا فرض انجام دیتی رہیں۔ اس کے لئے ہمیں منوسمرتی کا مطالعہ کرنا چاہیئے جسے ہندومت کے مستند ترین قانونی ماخذ ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ اور جو اپنے کو ہندومت کے قدیم ترین ماخذ یعنی ویدوں کی شارح اور ان کے محافظ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے[1]۔

منوسمرتی یوں تو انسانی زندگی سے متعلق تقریباً سبھی گوشوں کے سلسلے میں احکام و ہدایات پیش کرتی ہے لیکن اس کا سب سے نمایاں عنصر اس کا ذات پات کا نظام، ورن آشرم، اور طبقاتی امتیاز، کی تعلیم ہے، کہ اس سے متعلق اشلوکوں کو اگر کوئی شخص نقل کرنا بھی چاہے تو تھک کر اسے چھوڑنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کتاب کا مقصد تصنیف ہی اندرون ملک برہمنوں کی اجارہ داری کا استحکام اور حکومت کے ادارے سے لے کر اس کے عوام تک ہر ایک کو ان کی خدمت گذاری اور ان کی وفاداری کے لئے تیار کرنا ہے۔ صرف نمونے کے طور پر ہم اس کا ایک منتخب حصہ نقل کرتے ہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نسل انسانی کی یہ تقسیم کتنی بے رحم، کتنی ظالمانہ اور کتنی

---

[1] منوسمرتی (ادھیائے ۱: ۴)

جابرانہ تھی۔ منو انسانی نسل کو چار طبقوں میں تقسیم کرتا ہے یعنی برہمن، کشتری، ویشیہ اور شودر، اور پیدائش سے لیکر موت تک زندگی کے ہر میدان میں خاص طور پر شودر کو اسفل قرار دے کر اسے ابدالآباد تک کے لئے ذلت و رسوائی کے کھڈ میں گرا دیتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے[1]:

واسطے ترقی عالم کے (برہما نے) مکھ (یعنی منہ) سے براہمن کو، باہنہ سے کشتری کو جانگھ سے ویش کو اور پاؤں سے شودر کو پیدا کیا،
(ادھیائے ۱: ۳۱)[2]

اس پوری کائنات کی حفاظت کے لئے مہاتیجوی (بڑے مزاض) برہما نے منہ، باہنہ، جانگھ، چرن (یعنی پاؤں) سے پیدا ہوئے چار ورنوں کے کرم الگ الگ مقرر کئے (۱: ۸۷)

وید پڑھنا، وید پڑھانا، یگیہ کرنا، یگیہ کرانا، دان دینا، دان لینا یہ چھ کرم براہمن کے لئے بنائے (۱: ۸۸)

رعایا کی حفاظت کرنا، دان دینا، یگیہ کرنا، وید پڑھنا، دنیا کی نعمتوں میں دل نہ لگانا یہ پانچ کرم کشتری کے لئے مقرر کئے۔ (۱: ۸۹)

چارپایوں کی حفاظت کرنا، دان دینا، یگیہ کرنا، وید پڑھنا، تجارت کرنا، سود بیاج لینا، کھیتی کرنا یہ سات کام ویش کے لئے مقرر کئے (۱: ۹۰)

---

[1] ہمارے سامنے منوسمرتی کا لالہ سوامی دیال صاحب کا اردو ترجمہ ہے جو اصل سنسکرت متن کے ساتھ مطبع نول کشور کانپور سے دوسری بار شائع ہوا ہے لیکن یہ ترجمہ ہندی آمیز بہت ہے اس لئے ہم نے قارئین کی سہولت کے لئے حسب ضرورت ہندی الفاظ کو اردو میں بدل دیا ہے یا پھر ان کا اردو مرادف نقل کر دیا ہے اسی طرح جا بجا جملوں کی ساخت بھی تبدیل کر دی گئی ہے۔

[2] یہی مضمون رگ وید (۱۰: ۹۰: ۱۲) اور بھاگوت پران (۲: ۵: ۲۷) میں بھی آیا ہے۔ بحوالہ الجہاد فی الاسلام / ۳۶۵

شودر کے لئے ایک ہی کرم پربھو نے ٹھہرایا یعنی صدق دل سے ان تینوں ورنوں کی خدمت کرنا۔ (۱ : ۹۱)

منو کے نزدیک شودر کے حصے میں ذلت و پستی کے سوا اور کچھ نہیں، بڑائی صرف برہمن کے لئے ہے۔

دنیا میں براہمن بوجہ دھرم کے سب سے افضل ہے۔ اس لئے کہ نہایت پاک عضو (یعنی منہ) سے پیدا ہوا ہے اور وید کا استعمال رکھتا ہے (۱ : ۹۳)

جو کچھ دنیا میں ہے وہ سب گویا براہمنوں کی نج کی چیز ہے کیوں کہ برہماجی کے مکھ سے پیدا اور سب سے افضل ہے۔ اس لئے سب چیزوں مالک براہمن ہو سکتا ہے (۱ : ۱۰۰)

براہمن کے نام میں لفظ منگل یعنی خوشی اور کشتری کے نام میں لفظ بل یعنی طاقت اور ویشیہ کے نام میں لفظ دھن یعنی دولت اور شودر کے نام میں لفظ تند یعنی تحقیر شامل کرنا چاہیئے (۲ : ۳۱)

براہمن، کشتری، ویشیہ اور شودر ان کے نام کے آخر میں الفاظ شرم (یعنی محنت) رکشا (یعنی حفاظت) پشٹ (یعنی طاقت) اور پریشیہ (یعنی ذلت) شامل کرنا چاہیئے (۲ : ۳۲)

دو بج ذاتیں صرف تین ہیں یعنی براہمن، کشتری و ویشیہ، چوتھی ذات شودر کا صرف ایک جنم ہے اور کوئی ذات پانچویں نہیں ہے۔ (۱۰ : ۴)

معاشرتی زندگی میں منو شودر اور اس کے ہم جنس چانڈال کو یہ مقام دیتا ہے۔

شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے براہمن نرک میں جاتا ہے اور اس سے لڑکا پیدا ہونے سے دھرم کرم سے الگ ہو جاتا ہے (۳ : ۱۷)

چانڈال، سور، مرغا، کتا، حیض والی عورت، نامرد یہ سب لوگ برہمنوں کو بھوجن کرتے ہوئے نہ دیکھیں۔ (۳ : ۲۳۹)

جو کوئی شرادھ (دعوت بعد مرگ) کے ان کو بھوجن کرکے جوٹھا ان شودر کو دیتا ہے وہ موڑھ نیچے سر کئے ہوئے کال سوتر نام نرک میں جاتا ہے (۳ : ۲۴۹)

شودر کو صلاح نہ دے سوائے داس (یعنی اپنے غلام) کے اور شودروں کو جوٹھا ان نہ دے جو بیہ یون کرنے سے بچ رہا ہے وہ شودر کو نہ دے اور دھرم اور برت کا اپدیش بھی شودر کو نہ دے (۴ : ۸۰)

جو برہمن کا ہم ذات موجود ہو تو اس مردہ برہمن کو شودر نہ لیجائے کیونکہ شودر کے چھونے سے اس کے بدن کی آگ میں آہت دینا (یعنی جلانا) سورگ کے واسطے نہیں ہوتا۔ (۵ : ۱۰۴)

نیائے (یعنی انصاف) سے رہنے والے شودر کو مہینہ کے اندر ایک بار مجامت کرانا چاہیئے، اس کی طہارت ویشیہ کی مانند ہے اور برہمن کا پس خوردہ اس کی غذا ہے (۵ : ۱۴۰)

منو شودر کے لئے مذہبی علم کے دریچوں کو بھی بند قرار دیتا ہے۔

جو شخص شودر کو دھرم اور برت کا اپدیش دیتا ہے وہ مع اس شودر کے اسمبرت نام نرک میں جاتا ہے (۴ : ۸۱)

پڑھنے میں حرف حرف صاف زبان سے نکلے اور شودر کے پاس نہ پڑھے[1] اور اگر رات کے چوتھے پہر میں وید کے پڑھنے سے تھک جائے تو

---

[1] اسی طرح گوتم (۱۲ : ۴ - ۶) میں ہے: اگر کوئی شودر بالارادہ وید کے الفاظ سن لے تو اس کے کان میں پگھلی ہوئی رانگ یا لاکھ ڈال دی جائے، اگر وید کی عبارت پڑھے تو

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

سوئے نہیں ۔ (۴ : ۹۹)

اسی طرح منو برا ہمنوں کے سلسلے میں دائمی فضیلت کا اعلان کرتا اور ان کے سلسلے میں راجہ کو درج ذیل ہدایات دیتا ہے :

راجہ صبح اٹھ کر رگ یجر سام ویدوں کے ارتھ (مطلب) جاننے والے برا ہمنوں کا درشن اور پوجن کرے اور ان کا تابع حکم رہے (۷ : ۳۷)

برا ہمنوں کے پڑھنے اور آچرن کو سمجھ کر (یعنی ان کی علمی اور عملی حیثیت کے مطابق) ان کی ایسی معاش تجویز کرے جو ان کے دھرم کے خلاف نہ ہو اور ان کی حفاظت سب طرف سے اس طرح سے کرے جس طرح باپ بیٹے کی کرتا ہے ۔ (۷ : ۱۲۵)

جو ذات ہی میں برا ہمن ہو، اور برا ہمن کا کرم (عمل) کچھ بھی نہ کرتا ہو اور مورکھ (یعنی بیوقوف) ہو تو بھی وہ راجہ کو دھرم کا اپدیش کر سکتا ہے اور شودر کیسا ہی ہو وہ اپدیش نہیں کر سکتا (۸ : ۲۰)

لیکن اس کے بعد ہی شودر کے سلسلے میں وہ ان حقائق کا اعلان کرتا ہے ۔

جس دھرم کا بچار شودر کرتا ہے اس راجہ کا راج اس کے دیکھتے ہی دیکھتے مٹ جاتا ہے ۔ جیسے دلدل میں گئو (گائے) پھنس کر مر جاتی ہے ۔ (۸ : ۲۱)

جس راج میں شودر اور ناستک (ملحد) بہت ہیں، برا ہمن وکشتری ودیشیہ نہیں ہیں وہ تمام راج قحط و آفت سے پریشان ہو کر جلد مٹ جاتا ہے (۸ : ۲۲)

تو اس کی زبان کاٹ لی جائے اور اگر وہ اس کو یاد کرے تو اس کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں ۔ بحوالہ الجہاد فی الاسلام / ۳۶۶

فوجداری قوانین میں شودر کی حالت زار کا جائزہ منوسمرتی کے درج ذیل اشلوکوں سے لگایا جاسکتا ہے۔

اگر شودر برہمن یا کشتری یا ویشیہ سے سخت زبانی کرے تو اس کی زبان میں سوراخ کیا جائے کیونکہ وہ عضو حقیر یعنی پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔ (۸: ۲۷۰)

جو شودر (ارے تو فلانا برہمن سے نیچ) ایسا باآواز بلند برہمن وغیرہ کے نام اور ذات کو کہے تو اس کے منہ میں بارہ انگل کی سیخ آہنی جلتی ہوئی ڈالنی چاہئے۔ (۸ : ۲۷۱)

جو شودر برہمنوں کو غرور سے دھرم کا اپدیش کرنے والا ہے اس کے منہ اور کان میں گرم تیل راجہ ڈالے (۸ : ۲۷۲)

چانڈال وغیرہ جس عضو سے بڑے آدمیوں کے عضو پر ضرب کرے اس عضو کو کاٹ ڈالنا یہی من جی کا حکم ہے۔ (۸ : ۲۷۹)

ہاتھ کے ضرب سے مارے تو ہاتھ کاٹنا چاہئے، پاؤں کے ضرب سے مارے تو پاؤں کاٹنا چاہئے۔ (۸ : ۲۸۰)

چھوٹا آدمی بڑے آدمی کے ساتھ ایک آسن (نشست) پر بیٹھے تو اس کی کمر میں نشان کر کے نکال دیوے خواہ اس طرح اس کے چوتڑ کو کاٹ دے کہ وہ مرنے نہ پاوے (۸ : ۲۸۱)

غرور سے بدن پر تھوکے تو دونوں ہونٹ چھید ڈالے اور پیشاب کرے تو عضو تناسل کو کاٹ ڈالے اور براز کرے تو مقعد کاٹ ڈالے (۸: ۲۸۲)

دنیا کی زندگی میں شودر کا وظیفۂ حیات صرف برہمن کی خدمت ہے۔ اس سے ہٹ کر دولت وغیرہ کمانے کا خیال بھی اسے اپنے دل میں نہیں لانا چاہئے۔

جو شودر خرید کیا گیا ہو یا نہ خرید کیا گیا ہو اس سے داس (یعنی غلام)

کا کام کرنا چاہیئے کیونکہ براہمن کا داس کرم (یعنی برہمن کی غلامی) کے واسطے ہی سری برہماجی نے شودر کو پیدا کیا ہے (۸ : ۴۱۳)

مالک اگر شودر غلام کو غلامی سے آزاد کرنا بھی چاہے تو وہ آزاد نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ غلامی اس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ اس کی اس فطرت کو کون بدل سکتا ہے (۸ : ۴۱۴)

براہمن شودر غلام سے دولت لیوے اس میں کچھ تامل نہ کرے کیونکہ وہ دولت کچھ اس کی ملکیت نہیں ہے وہ بے زر ہے، وہ جو دولت فراہم کرے اس دولت کا مالک اس کا سوامی (آقا) ہے (۸ : ۴۱۷)

اس کے برعکس برہمن کی عزت اس کا پیدائشی معاملہ ہے۔ اس کی عملی زندگی جیسی کچھ بھی ہو اس کے تقدس پر کوئی حرف نہیں آتا۔

جس طرح آگ جلائے یا نہ جلائے تاہم وہ بڑا دیوتا ہے اسی طرح براہمن پنڈت (یعنی عالم) ہو یا مورکھ (یعنی بے وقوف) تو تاہم بڑا دیوتا ہے (۹ : ۳۱۷)

اسی طرح براہمن اگرچہ تمام اعمال ناشائستہ کرتے ہیں تاہم پوجنے کے لائق ہیں اور بڑے دیوتا ہیں۔ (۹ : ۳۱۹)

برہماجی نے ویشیہ کو پیدا کرکے اس کو پشو (یعنی چارپایہ) دیا اور براہمن وکشتری کو تمام رعیت دی (۹ : ۳۲۷)

بڑی ذات، اعلیٰ جگہ سے پیدائش، اصولوں کی پیروی اور اونچی روایات، ان وجہوں سے براہمن سب سے بڑا ہے اور سب ورنوں کا گرو (استاد) اور پربھو (مالک) ہے۔ (۱۰ : ۲)

اور شودر کی نجات اس سے وابستہ ہے کہ وہ اس براہمن کی خدمت کرتا رہے۔ اس لئے کہ اس کی پیدائش ہی اس مقصد کے لئے ہوئی ہے۔

ویدپڑھنے والے نیک نام دنیا میں مصروف (گرہستھ) براہمنوں کی خدمت شودروں کو نجات دینے میں عمل افضل ہے۔ (۹ : ۳۳۴)

پاکیزگی وخدمت بزرگان ونرم زبانی وخودی نہ کرنا وہمیشہ براہمنوں کی پناہ رہنا یہ سب کام شودروں کو اونچی ذات دینے والے ہیں۔ (۹ : ۳۳۵)

براہمن کی خدمت شودر کا سب سے اونچا کرم (عمل) ہے اس کو چھوڑ کر وہ جو کچھ بھی کرتا ہے سب نشپھل (بے فائدہ) ہے (۱۰ : ۱۲۳)

یہ تو حال تھا شودروں کا۔ ان کے ہم جنس چانڈال اور سوپچ وغیرہ کے لئے منو یہ مقام تجویز کرتا ہے۔

چانڈال وسوپچ یہ دونوں گاؤں کے باہر قیام کریں، برتن وغیرہ سے محروم رہیں، ان کی دولت سگ وخر ہے۔ (۱۰ : ۵۱)

مردے کے کپڑے پہنیں، اور پھوٹے ہوئے برتن میں کھانا کھائیں زیور آہنی زیب بدن کریں ہمیشہ گشت کرتے رہیں (۱۰ : ۵۲)

دھرتما (مذہبی) آدمی ان لوگوں کے ساتھ دیکھنے اور ملنے کا معاملہ نہ رکھے، ان کا شادی بیاہ آپس میں ہوتا ہے، اور میل ملاپ بھی یہ آپس ہی میں رکھیں۔ (۱۰ : ۵۳)

ان کی خوراک دوسروں کے اختیار میں ہے، پھوٹے برتن میں کھانا دینا چاہئے، اور یہ لوگ وقت شب گاؤں وشہر وغیرہ میں پھرنے نہ پاویں۔ (۱۰ : ۵۴)

یہ لوگ نشان ذات سے مشمول ہو کر بحکم راجہ ملک کے کام کرنے کے واسطے دن میں پھریں اور جس مردہ کا کوئی رشتہ دار مرگیا ہو اس کو لے جائیں۔ مذہب کا یہ فرمان ہے۔ (۱۰ : ۵۵)

یہ لوگ بحکم راجہ موافق طریق شاستر کے قتل لائق آدمیوں کو قتل کریں، اور انھیں مقتولوں کا کپڑا دلنگ و پارچہ وزیور لیویں (۱۰ : ۵۶)

اور آخر میں ایک بار پھر منو کی ہدایات کی روشنی میں شودر و برہمن کی جداگانہ حیثیتوں کا موازنہ کرتے چلئے۔

جو شودر اپنا خدمت گذار اور اپنی پناہ میں ہے اس کو جوٹھا غلہ اور پرانا کپڑا دلغیر ساز کا دھانیہ و پرانی چارپائی و گھر کا پرانا اسباب دینا چاہئے (۱۰ : ۱۲۵)

شودر طاقت رکھتا (سمرتھ) ہو پھر بھی دولت جمع نہ کرے کیونکہ دولت پاکر برہمن ہی کو تکلیف دیتا ہے۔ (۱۰ : ۱۲۹)

برہمن یگیہ کے لئے شودر سے کبھی دھن نہ مانگے، اگر مانگ کر اس دھن سے یگیہ کرے تو دوسرے جنم میں چانڈال ہوتا ہے۔ (۱۱ : ۲۴)

جو برہمن شودر سے دھن لے کر اگن ہوتر کرتا ہے وہ شودر ہی کا ہمجنس (رتوج) ہے۔ اس کو کچھ پھل نہیں ہوتا۔ اور وید پڑھنے والے برہمنوں میں نندت (قابل نفرت) کہلاتا ہے۔ (۱۱ : ۴۲)

برہمن اپنی پیدائش ہی سے دیوتاؤں کا دیوتا ہے اور اس کا فرمان (اپدیش) سب کو ماننے کے لائق ہے۔ یہ باتیں وید ہی کی بیان کردہ ہیں اور وید ہی ان کا سبب ہے (۱۱ : ۸۴)

بلی، نیولا، نیل کنٹھ، مینڈھک، کتا، گوہ، اُلو، کوا، ان میں سے کسی ایک کو مارنے کا وہی کفارہ ہے جو شودر کو قتل کرنے کا ہے۔ (۱۱ : ۱۳۱)

برہمن کا تپ (ریاض) برہم گیان (یعنی تعلیم مذہب) ہے، کشتری کا تپ حفاظت عالم ہے۔ ویشیہ کا کاتپ زراعت وغیرہ ہے، شودر کا سیوا ہے۔ (۱۱ : ۲۳۶)

منوسمرتی کے یہ اشلوک کسی شرح و بیان کی حاجت نہیں رکھتے۔ انھیں دیکھ کر ہاشم کے علمبرداروں کو بھی اپنے ذہن کی نارسائی کا ماتم کرنا ہوگا۔ یقیناً جس مذہب کے یہ عقائد ہوں اس کے پیروؤں کی طرف سے عام ابنائے انسانیت کے ساتھ عدل و انصاف اور آزادی و مساوات کے برتاؤ کا تو کیا سوال پیدا ہوتا ہے، اپنے ہم مذہب افراد و جماعات کے سلسلے میں بھی ان سے کسی ایسی روش کی توقع رکھنا اس سے ذرا بھی مختلف نہ ہوگا کہ کوئی شخص آگ سے اپنی پیاس بجھانے کی توقع کرے۔ آج ہندوستان میں ہریجن آبادیاں اور دوسرے پچھڑے ہوئے طبقات جس حالت زار کا شکار ہیں وہ اس حقیقت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

یہودیت

ہندومت کے بعد دنیا کا دوسرا بڑا قدیم مذہب یہودیت ہے جس کے ماننے والے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں[1] لیکن اس کے اوپر قومی تفوق اور نسلی برتری کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اس سے غیر قوموں کے ساتھ عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کے برتاؤ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان عزیز قدردں کو رواج دلانے کے سلسلے میں نہ تو یہودیت کا کبھی کوئی بین الانسانی کردار رہا ہے اور نہ کبھی اس نے اس کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کے برخلاف آج بھی کتاب مقدس میں ایسی بے شمار آیات موجود ہیں جو علیٰ رؤس الاشہاد یہودی قوم کی

---

[1] واضح رہے کہ اس سے ہماری مراد موجودہ یہودیت ہے، جو یہودی قوم کی ایجاد کردہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نام سے کوئی مذہب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ سے صرف ایک مذہب نازل ہوا ہے اور وہ ہے اسلام۔ یہودیت اور عیسائیت وغیرہ اسی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ اسی طرح کتاب مقدس جو ان مذاہب کی علمبردار ہے وہ خود یہودی اور عیسائی تحریفات کی ستم خوردہ ہے۔ پس ہماری گفتگو موجودہ یہودیت اور مسیحیت سے ہے جیسی کچھ ــــ کی وہ ان کتابوں میں موجود ہے۔ نہ وہ حقیقی اسلام جسے بعد میں یہودیت اور عیسائیت کا نام دے لیا گیا۔

نسلی برتری کا اعلان کرتی ہیں۔ بزرگ و برتر خدا جس نے ساری کائنات کو پیدا کیا ہے اور سارے انسانوں کا پالنے والا ہے کتاب مقدس اسے مخصوص طور پر بنی اسرائیل اور عبرانیوں کا خدا قرار دیتی ہے۔ آیاتِ ذیل کی خط کشیدہ عبارتوں پر نظر ڈالئے:۔

● اور وہ تیری بات سنیں گے اور تو اور بنی اسرائیل کے بزرگ مصر کے بادشاہ کے پاس جانا اور اس سے کہنا کہ خداوند عبرانیوں کے خدا نے ہم کو بلایا ہے۔ اور ہم تین دن کی راہ بیابان میں جائیں گے اور خداوند اپنے خدا کے قربانی گزاریں گے۔

(خروج باب ۳: ۱۸)

● بعد اس کے موسیٰ اور ہارون نے اندر جا کر فرعون سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ وہ بیابان میں میرے لئے عید کریں۔ فرعون نے کہا کہ وہ خداوند کون ہے کہ میں اس کی بات مانوں اور بنی اسرائیل کو جانے دوں؟ میں خداوند کو نہیں جانتا اور نہ میں بنی اسرائیل کو جانے دوں گا۔ تب انھوں نے کہا کہ عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے۔ سو ہم تین دن کی راہ بیابان میں جائیں گے اور خداوند اپنے خدا کے لئے قربانی کریں گے۔ تا نہ ہو کہ وہ ہمیں وبا یا تلوار سے مارے۔

(ایضاً: باب ۵: ۱-۳)

● اور اس سے کہنا کہ خداوند عبرانیوں کے خدا نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ بیابان میں وہ میری بندگی کریں لیکن تو نے ابھی تک نہیں سنا۔[1]

(ایضاً: باب ۷: ۱۶)

یہی نہیں بلکہ ایک موقع پر تو خداوند اسرائیل کو اپنا پہلوٹھا بیٹا قرار دیتا ہے۔

● تب تو فرعون سے یوں کہنا کہ خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا پہلوٹھا بیٹا ہے۔ سو میں تجھ سے کہتا ہوں کہ میرے بیٹے کو جانے دے تاکہ وہ میری بندگی کرے اور

---

[1] یہی مضمون باب ۹ آیت ۱ و ۱۳، باب ۱۰ آیت ۳ میں بھی آیا ہے۔

اگر اسے نہیں جانے دیتا تو دیکھ میں تیرے پہلوٹھے بیٹے کو مار ڈالوں گا۔
(ایضاً: باب ۴: ۲۲، ۲۳)

شائد یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اپنے کو مخصوص طور پر خدا کا بیٹا اور اس کا چہیتا تصور کرتے تھے[1] اور یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں چاہے وہ جو کچھ بھی کرتے رہیں قیامت میں جہنم کی آگ انھیں چند دن سے زیادہ نہیں چھوئے گی[2] یقیناً جس کسی گروہ کے یہ معتقدات ہوں اس کی طرف سے عام انسانوں کے سلسلے میں عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کے رویہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور معاملہ کسی قیاس و استنباط کا نہیں۔ اسے تو ان کے مذہب کی باقاعدہ سند حاصل ہے۔ چنانچہ کتاب مقدس میں اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں کے درمیان بھی یہ کتاب اجنبیوں اور پردیسیوں کے نام سے یاد کرتی ہے۔ کھلے لفظوں میں امتیازی سلوک روا رکھنے کی تلقین کی گئی ہے جیسا کہ کتاب تثنیہ میں ہے:

ہر سات سال کے بعد تو معافی عمل میں لانا اور معافی کا طریقہ یہ ہے کہ جس کسی نے اپنے پڑوسی کو کچھ قرض دیا ہو تو وہ اس کو معاف کرے اور اپنے بھائی اور پڑوسی سے اسے طلب نہ کرے کیونکہ یہ خداوند کی معافی کا سال ہے۔ پردیسی سے تو طلب کر سکتا ہے مگر جو کچھ تیرا تیرے بھائی پر ہے تو اسے معاف کر۔ (باب ۱۵: ۱، ۳)

---

[1] مائدہ آیت ۱۸ میں قرآن نے بھی ان کے اس دعوے کو نقل کیا ہے۔

[2] اسی طرح بقرہ آیت ۸۰ میں ان کی اس اس خوش فہمی کا تذکرہ موجود ہے۔ خیال رہے کہ ان مقامات پر قرآن سے ہمارا استدلال ضمناً ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ قرآن کے عائد کردہ ان الزامات کے جواب میں اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی خاموشی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ انھیں یہ باتیں بالکل تسلیم تھیں۔ ورنہ اگر انھیں کوئی اعتراض ہوتا تو قرآن اسے ضرور نقل کرتا۔ آگے عیسائیت کے ذیل میں بھی یہی بات ملحوظ خاطر رہے۔

تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دے۔ نہ نقدی نہ غلہ اور نہ کوئی چیز جو سود پر قرض دی جا سکتی ہے۔ اجنبی کو تو سود پر قرض دے سکتا ہے مگر اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا تاکہ اس ملک میں جس کا مالک بننے کے لئے تو جاتا ہے خداوند تیرا خدا تیرے ہاتھ کے سارے کاموں میں برکت بخشے۔ (باب ۲۳: ۱۹-۲۰)[۱]

یہی نہیں بلکہ کتاب مقدس کے نزدیک کسی شخص کو غلام بنا کر بیچنا بھی صرف اسرائیلیوں کی نسبت سے جرم اور گناہ ہے۔ غیروں کے ساتھ یہ معاملہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ چنانچہ اسی کتاب تثنیہ میں آگے ہے:

اگر کوئی انسان پایا جائے جو اپنے بھائیوں یعنی بنی اسرائیل میں سے کسی کو چرا لے گیا اور اس کو غلام بنایا یا بیچ دیا تو چرانے والا مارا جائے اور تو اس شرارت کو اپنے درمیان سے دفع کر۔

(باب ۲۴: ۷)

مطلب یہ کہ غیروں کا معاملہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بات ہے تو امتیازی سلوک ہی کی تاہم اس سلسلے میں کتاب مقدس کا لب و لہجہ پھر بھی نرم ہے لیکن تالمود کے درج ذیل بیان نے تو اس کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔

اگر اسرائیل کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں، مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ کوئی گری پڑی چیز ملے تو اسے دیکھنا چاہیئے کہ گرد و پیش آبادی کن لوگوں کی ہے۔ اگر اسرائیلیوں کی ہو تو

---

[۱] قرآن حکیم میں بھی یہود کے اس دوہرے معیار کی طرف نشاندہی کی گئی ہے ملاحظہ ہو آل عمران آیت ۱۷۵۔

اسے اعلان کرنا چاہیئے۔ غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیئے۔ ربی شموائل کہتا ہے کہ اگر امی اور اسرائیلی کا مقدمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جتوا سکتا ہو تو اس کے مطابق جتوائے اور کہے یہ ہمارا قانون ہے۔ اور اگر امیوں کے قانون کے تحت جتوا سکتا ہو تو اس کے تحت جتوائے اور کہے کہ یہ تمہارا قانون ہے۔ اور اگر دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہو کرے۔ ربی شموائل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی ہر غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیئے[1]

کیا اس کے بعد بھی یہودیت کے علمبرداروں کی طرف سے دوسرے انسانوں کے ساتھ عدل و انصاف اور آزادی و مساوات کے برتاؤ کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ (باقی آئندہ)

---

[1] بحوالہ تفہیم القرآن ۱/۲۲۶

اسلامی معاشرت پر سید جلال الدین عمری کی بعض اور نئی کتابیں

عورت اور اسلام عورت کے بارے میں اسلام کا کیا نقطۂ نظر ہے؟ خاندان میں ماں، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے اس کا کیا مقام ہے علم و عمل کے میدان میں اس نے کیا خدمات انجام دی تھیں۔ قیمت ۲ روپے (اس کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے)

مسلمان خواتین کی دعوتی ذمہ داریاں عورت کی جد و جہد کا میدان میاں بیوی، دینی معاملات میں ایک دوسرے سے تعاون مطلوب ہے۔ داعی خواتین کے لئے مطلوبہ صفات۔ یہ ہیں اس رسالہ کے بعض اہم مباحث۔ قیمت 1-50

بچے اور اسلام قیمت ۵۰/- ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی دو اصلاحی تصانیف

ڈاکٹر معظم علی خاں

شاہ اسماعیل شہید نے اوائل عمر ہی سے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا اور اپنی خارجی زندگی کی مصروفیات کے باوجود وہ کسی وقت اپنے اس مشغلے سے غافل نہیں ہوئے[1]۔ انھوں نے بہت سی کتابوں کی تصنیف کے علاوہ کچھ کتابوں پر قیمتی حواشی بھی لکھے تھے[2] لیکن بدقسمتی سے وہ ہم تک نہیں پہنچ سکے اور ضائع ہو گئے۔

اگرچہ آپ کو تصنیف و تالیف کا موقع بہت کم ملا پھر بھی آپ کی تصانیف مشہور علماء کے مقابلے میں تعداد اور اہمیت کے لحاظ سے خاص طور پر قابل قدر ہیں[3] اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اکثر تصانیف دوران سفر میں تحریر کی گئیں، جن پر نظر ثانی بھی نہ ہو سکی۔ لیکن اس کے باوجود مضامین کی بلاغت، املا کی فصاحت، زور کلام کی لطافت، معانی کی تحقیق، تمام تصانیف میں ایسی زوردار ہے کہ ہم عصروں کے انداز و اطوار سے بڑھ کر سلف کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ اگر اطمینان خاطر اور جمعیت قلبی کے ساتھ شاہ اسماعیل شہید یکسو ہو کر تصنیف و تالیف کا کام کرتے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا کارنامے

---

[1] عبداللہ بٹ (مرتب) "شاہ اسماعیل شہید"، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ، لاہور ۱۹۵۵ء، ص ۵۰

[2] سرسید احمد خاں: آثار الصنادید: انڈیا فوٹو آفسیٹ کوہ نور پریس دہلی ۱۹۶۵ء: ص ۵۵۱

[3] مضمون غلام رسول مہر: دائرۃ المعارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۴ء، ۲/۷۵۳

انجام دے ڈالتے [1]

مولانا شاہ اسماعیل شہید صرف ایک مجاہد اور مدبّر ہی نہیں بلکہ اپنے زمانے کے ایک ایسے مصنف بھی ہیں جنھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے، اسے تشنہ نہیں چھوڑا مولانا محمد یوسف بنوری فرماتے ہیں:۔

"وہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھائیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک کوہ عظیم اپنے وسیع و عریض دامن میں مستور بے شمار صاف اور چمکدار چشموں کے ذریعہ ایک عالم کو سیراب کر رہا ہے"۔ [2]

مفتی سید احمد حسن امروہوی مولانا اسماعیل شہید کی تصانیف پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"فی سائر تصانیفه هو تفصیل	ان کی تمام تصانیف میں تفصیل و
لما اجمل و بیان لما اضمر	توضیح ہے ان احکام و معانی کی جو
فی الآیات و احادیث نبیّه	آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ میں
الکریم و ذالك فضل الله	موجود ہیں۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے
یوتیه من یشآء و الله	وہ جسے چاہے اس سے
ذوالفضل العظیم"۔ [3]	نواز دے۔

مولانا شاہ اسماعیل شہید کی تصانیف کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مختلف موضوعات کو اپنی تحقیق کی جولانگاہ بنایا ہے۔ ان کی خاص توجہ توحید کی صحیح تعلیمات اور شرک و بدعات کے بارے میں شکوک و شبہات کو رفع کرنے کی طرف رہی

---

[1] نواب صدیق حسن خاں: اتحاف النبلاء: مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۸ء ص ۴۱۷

[2] مولانا محمد یوسف بنوری: (تعارف) شاہ اسماعیل شہید 'طبقات' (عربی) المجلس العلمی کراچی ۱۳۸۰ھ ص ۳

[3] عزیز الدین مراد آبادی: اکمل البیان: المکتبہ السلفیہ لاہور ۱۹۶۵ء ص ۸۲۷

ہے۔ اس کے علاوہ فقہ، عقائد، تصوف، سیاست اور دیگر موضوعات پر بھی ان کی تصانیف اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ ان کا انداز نہایت محققانہ اور مخالفین کو خاموش کر دینے والا ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی ہر تصنیف میں قرآن اور حدیث نبویہ کی روشنی میں مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور نہایت قوی دلائل سے اپنے مخالفین کو خاموش کیا ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیت اور ذہانت کی وجہ سے اپنی انتہائی غیر علمی مصروفیات کے باوجود ایسی اہم کتابیں تصنیف کیں جو آج تک اپنے موضوع کے لحاظ سے صفِ اوّل میں شمار کی جاتی ہیں۔ ذیل میں آپ کی صرف دو اہم کتابوں کا تفصیلی تعارف کرایا جا رہا ہے۔

رد الاشراک (عربی)

یہ رسالہ شرک اور غیر مشروع مراسم کی رد میں آیات اور احادیث کا مجموعہ ہے۔ پوری کتاب کی ترتیب سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذریعہ شاہ اسماعیل شہید کلمہ طیبہ کے ہر دو جز کی تشریح کرنا چاہتے تھے[1] اس میں دو باب ہیں

۱۔ باب الاجتناب عن الاشراک

۲۔ باب الاعتصام بالسنۃ والاجتناب عن البدعۃ

پہلے باب کو مزید چار قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے

۱۔ باب رد الاشراک فی العلم

۲۔ ذکر رد الاشراک فی التصرف

۳۔ ذکر رد الاشراک فی العبادۃ

۴۔ ذکر رد الاشراک فی العادات

---

[1] مولانا نسیم احمد فریدی: تذکرہ شاہ اسماعیل شہید: الفرقان بکڈپو لکھنو ۱۹۷۷ء: ص ۳۴

اسی طرح دوسرا باب چھ فصلوں پر منقسم ہے۔

(۱) ذکر حقیقت الایمان

(۲) ذکر الایمان بالقدر

(۳) ذکر الصحابۃ واھل البیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم

(۴) ذکر رد بدعات القبور

(۵) ذکر رد بدعات التقلید

(۶) ذکر بدعات الرسوم

آخر الذکر فصل کے تحت مندرجہ ذیل رسوم پر بحث کی گئی ہے۔

افتخار بالانساب، افراط التعظیم فی مابینھم، المغالات فی المھور والاسراف فی الولائم، ممانعۃ من نکاح الثانی، النوحۃ والاحداد اور افراط التزئین۔

افراط التزئین کی رسم کو شاہ اسماعیل شہید نے بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس ذیل میں ان تمام قابل اعتراض عادات و رسوم کا ذکر کیا ہے جو عام طور پر زینت کے لئے عورتوں اور مردوں میں عمومی طور پر نہ صرف اس دور میں پائی جاتی تھیں بلکہ آج بھی موجود ہیں، مثال کے طور پر عورتوں کے لئے جسم اور چہرے کی بے جا آرائش، مردوں کا ریشمی لباس پہننا، مرد و عورت کا ایک دوسرے سے مشابہت پیدا کرنا، مردوں کے لئے سرخ کپڑے کا پہننا، تصویروں سے مکانات کو سجانا، لباس کو رعونت کے ساتھ پہننا یا لباس کے ذریعہ خود کو نمایاں کرنا، عورتوں کے لئے باریک کپڑے کا پہننا اور مردوں کے لئے سونے اور زعفرانی رنگ کا استعمال، وغیرہ وغیرہ۔

شاہ اسماعیل شہید خود ہی رد الاشراک کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں[1]

---

[1] مولانا نسیم احمد فریدی: تذکرہ شاہ اسماعیل شہید: ص ۳۵

گویدایں بندہ ضعیف و رذیل — نام او ہست عاجز اسماعیل
ایں احادیث چند جمع شدہ — کہ ازاں اصل شرک قمع شدہ
طرفہ تر آنکہ ایں حدیث نبی — شد موئد بقول اب قوی
انچہ تقدیم او لاً کردم — ردّ اشراک مجملاً کردم

یہ رسالہ ذی قعدہ ۱۲۸۹ھ میں نواب سید محمد صدیق حسن خان بہادر نے اس کی تخریج کرکے "الادراک لتخریج احادیث رد الاشراک" کے نام سے اپنی کتاب "قطف الثمر فی بیان عقیدۃ اھل الاثر" کے آخر میں ایک ہی جلد میں مرتب کیا۔ جو سنہ ۱۲۹۰ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ الادراک لتخریج احادیث رد الاشراک، کل ۳۶ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ پوری کتاب میں ۷۶ صفحات ہیں۔

تقویۃ الایمان (اردو)

شاہ اسماعیل شہید کی یہ سب سے اہم اور مشہور تصنیف ہے جس میں اسلام کے بنیادی عقائد توحید و شرک اور بدعت و اتباع سنت سے بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے پہلے یہ کتاب عربی زبان میں "رد الاشراک" کے نام سے لکھی تھی اور اس کے پہلے باب کا تشریحی اردو ترجمہ بھی خود ہی کیا تھا[1]۔ لیکن تنظیم جہاد اور شہادت عظمیٰ نصیب ہونے کے باعث دوسرے باب کا ترجمہ وہ نہ کر سکے[2]۔ اور اس کا تشریحی ترجمہ اردو زبان میں ان کے ایک شاگرد مولانا محمد سلطان مرحوم نے سن ۱۲۵۰ھ میں کیا اور اس کا نام "تذکیر الاخوان بقیہ تقویۃ الایمان" رکھا چنانچہ محمد سلطان صاحب لکھتے ہیں:۔

"اب سن بارہ سو پچاس ہجری میں اللہ تعالیٰ نے اس خاکسار گنہگار

---

[1] سید ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہید: پونا لیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ ۱۹۴۱ء ص ۳۵۴
[2] محمد سلطان: شاہ اسماعیل شہید: تذکیر الاخوان بقیہ تقویۃ الایمان: کتب خانہ رحیمیہ دیوبند ص ۲۔

بیچمدان محمد سلطان کے دل میں ارادہ اس کے ترجمہ کا ڈالا، سو اس دوسرے باب کا ترجمہ ہندی بولی (اردو) میں شروع کیا اور تذکیر الاخوان بقیہ تقویۃ الایمان، اس کا نام رکھا۔ اتمام کو پہنچانا اور قبول کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ [1]

دوسری خارجی شہادت جو اس کتاب کی تاریخ تصنیف سے ہم کو بہت قریب کر دیتی ہے وہ ملا بغدادی کے نام شاہ صاحب کا عربی مکتوب ہے جس میں انھوں نے ملا بغدادی کے ان اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں جو ان کے دل میں تقویۃ الایمان کے مطالعہ سے پیدا ہوئے تھے۔ اس خط کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:

"ثم هذ المكتوب حين كنت نزيلا فى الكانفور سنة الف ومائتين واربعين الى السيد البغدادى حين وسوسه الجهال فبعد قرأته كتابى هذا جاءنى معتذرا وقال لقد صدقت فيما الفت فى رسالتك"۔ [2]

(یہ خط سن بارہ سو چالیس ہجری اس وقت تمام ہوا جب کہ میں کانپور میں تھا اور سید بغدادی کے نام بھیجا گیا جب کہ جاہلوں نے ان کے دل میں وسوسہ ڈال دیا اسے پڑھ لینے کے بعد وہ عذر کرتے ہوئے میرے ہاں آئے اور کہا کہ تم نے اپنی کتاب (تقویۃ الایمان) میں جو کچھ لکھا ہے بالکل ٹھیک ہے)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب سنہ ۱۲۴۰ھ کے اوائل یا اس سے کچھ قبل تصنیف ہو کر اہل علم کی نظر سے گزر چکی تھی۔ ڈاکٹر محمد باقر نے بھی تقویۃ الایمان کو

---

[1] ایضاً ص ۲

[2] محمد سلطان / شاہ اسماعیل شہید: تذکیر الاخوان بقیہ تقویۃ الایمان: ص ۱۸۹

سنہ ۱۸۲۳ء کے قریب کی تصنیف بتایا ہے[1] جس کے لحاظ سے سال ہجری ۱۲۳۹ نکلتا ہے لیکن انھوں نے اس ذیل میں کوئی حوالہ نہیں دیا۔

اگرچہ یہ مختصر رسالہ ہے مگر اپنی افادیت اور جامعیت کے لحاظ سے بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پہلے باب کا ترجمہ انگریزی زبان میں بھی "SUPPORT OF THE FAITH"[2] کے نام سے ہوچکا ہے جس کے مترجم میر حشمت علی ہیں۔ یہ ترجمہ لاہور سے مترجم کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوچکا ہے۔

---

[1] عبداللہ بٹ (مرتب): شاہ اسماعیل شہید ص ۵۱

غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ "راقم کے علم کے مطابق پہلی مرتبہ یہ کتاب (تقویۃ الایمان) مطبع دارالاسلام دہلی نے ۱۸۴۷ء میں شائع کی تھی" (ملاحظہ ہو دائرہ معارف اسلامیہ ص ۷۵۳) لیکن راقم الحروف کی نظر سے دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں تقویۃ الایمان کا ایک ایسا نسخہ گزرا جو ۱۲۴۲ھ میں یعنی شاہ اسماعیل شہید کی حیات ہی میں شائع ہوچکا تھا اور جسے مطبع احمدی کلکتہ نے چھاپا تھا۔ جب کہ واقعۂ شہادت سنہ ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) میں پیش آیا۔

[2] "SUPPORT OF THE FAITH" کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے اس پر کوئی تاریخ طباعت نہیں ہے اور اسے قریشی آرٹ پریس، لاہور نے چھاپا ہے۔

غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ تقویۃ الایمان کا انگریزی ترجمہ مولوی شہامت علی نے غالباً سنہ ۱۸۸۲ء میں شائع کیا تھا، ڈاکٹر محمد باقر نے بھی مترجم کا نام میر شہامت علی لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو مضمون غلام رسول مہر: اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۷۵۳/۲، عبداللہ بٹ: شاہ اسماعیل شہید: ص ۵۱) THE ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM میں بھی تقویۃ الایمان کے مترجم کا نام شہامت علی ہی دیا گیا ہے۔ (LEIDEN E. J. BRILL: THE ENCYCLOPAE-DIA OF ISLAM 1978 197/IV)

تقویۃ الایمان کی تالیف کا پس منظر

تقویۃ الایمان کی تالیف دراصل وقت کا ایک اہم تقاضا تھا۔ اس لئے کہ شاہ اسماعیل شہید نے اس دور میں آنکھ کھولی تھی جب مسلمان پوری طرح بدعات اور توہمات کا شکار ہو چکے تھے اور مشرکانہ رسوم و عقائد ہی کو اصل اسلام سمجھ بیٹھے تھے اس سے پہلے اگرچہ مجدد الف ثانی اپنی پوری کوشش کر چکے تھے لیکن مسلم معاشرے میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا تھا اس کی اصلاح میں وہ پوری طرح کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ ایسی صورت میں تقویۃ الایمان جیسی کتاب کی سخت ضرورت تھی، جو مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی توحید سے روشناس کرائے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو شاہ شہید کی یہ کتاب صرف کتاب ہی نہیں بلکہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے مسلمانوں کو اس خواب سے بیدار کیا جس میں وہ پڑے ہوئے تھے اس سلسلے میں ہم ایک روایت نقل کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ اس معاشرے میں کچھ سمجھدار لوگ ایسے بھی تھے جو غیر شعوری طور پر ان رسوم کی ناگواری محسوس کر رہے تھے۔

مولوی تبارک اللہ صاحب الدہن کے رہنے والے ایک شخص تھے جو بہت بوڑھے اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ اورنگ آباد میں وعظ کہا، وعظ کے بعد ان سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ تقویۃ الایمان کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، انھوں نے جواب دیا جب تقویۃ الایمان شائع ہو کر الدہن میں آئی تو لوگوں میں اس کا چرچا ہوا۔ کچھ لوگ مخالف ہو گئے اور کچھ موافق، اور اس کتاب کے بارے میں آپس میں بحث و مباحثہ اور گفتگو ہونے لگی اس وقت میرے چچا حیات تھے جو بہت ضعیف العمر تھے۔ آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا اور کانوں سے بھی اونچا سنتے تھے، انھوں نے جو یہ رنگ دیکھا تو ایک مرتبہ فرمایا۔ لڑکو میں چند روز سے دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ کچھ ورق ہاتھ میں لئے ہوئے بحث و مباحثہ کرتے ہو ہمیں

تو بتاؤ کہ کیا بات ہے۔ لوگوں نے کہا کہ جناب ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس پر یہ بحث و مباحثے ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کتاب مجھے سناؤ۔ لوگوں نے ان کو تقویۃ الایمان اول سے آخر تک سنائی۔ اس کو سن کر آپ نے فرمایا کہ سب بستی کے لوگوں کو جمع کر لو اس وقت میں اپنی رائے ظاہر کروں گا۔ جب سب لوگ جمع ہوئے تو آپ نے فرمایا:۔

"میں اب تک دنیا کی حالت دیکھتا رہا اور جو کچھ لوگ کہہ رہے تھے اور کر رہے تھے ان کی باتیں بالکل میرے جی کو نہ لگتی تھیں اور میں سمجھتا تھا کہ دنیا اس وقت گمراہی میں مبتلا ہے اور میرا جی ان باتوں کو ڈھونڈتا تھا مگر کنویں میں بھانگ پڑی ہوئی تھی۔ نہ کسی کو ان کی خبر تھی نہ کوئی بتلانے والا تھا۔ مولوی اسماعیل کا احسان ہے کہ انھوں نے پانی کو اور بھانگ کو الگ الگ کر دیا اور سیدھا راستہ بتلا دیا۔ اب تمہیں اختیار ہے چاہے مالو چاہے نہ مالو اور بھانگ ہی پیے جاؤ۔"[1]

ارواح ثلاثہ میں ہے:[2]

مولانا شاہ اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان لکھنے کے بعد اپنے خاص خاص لوگوں کو جمع کیا، جن میں سید احمد شہید صاحب، مولانا عبدالحی صاحب، شاہ اسحاق صاحب، مولوی محمد یعقوب صاحب، مولوی فرید الدین صاحب مرادآبادی، مومن خاں اور عبداللہ خاں علوی تھے۔ ان کے سامنے تقویۃ الایمان پیش کی اور فرمایا کہ میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آ گئے ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً ان امور کو جو شرک خفی تھے۔ شرک جلی لکھ دیا گیا ہے ان وجوہ سے اندیشہ

---

[1] ظہور الحسن کسولوی (مرتب) ارواح ثلاثہ: کتب خانہ امدادالغرباء سہارنپور: ص ۸۲

[2] ایضاً ص ۸۰

ہے کہ اس کی اشاعت سے شورش ضرور ہوگی اگر میں یہاں رہا تو ان مضامین کو آٹھ دس برس میں بتدریج بیان کرتا۔ لیکن اس وقت میرا ارادہ حج کا ہے اور وہاں سے واپسی پر عزم جہاد ہے اس لئے میں اس کام سے معذور ہو گیا اور میں دیکھتا ہوں کہ دوسرا اس بار کو اٹھائے گا نہیں۔ اس لئے میں نے یہ کتاب لکھدی ہے گو اس سے شورش ہوگی مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ میرا خیال ہے، اگر آپ حضرات کی رائے اشاعت کی ہو تو اشاعت کی جائے ورنہ اسے چاک کر دیا جائے۔ اس پر ہر شخص نے کہا کہ اشاعت تو ضرور ہونی چاہئے۔ مگر فلاں فلاں مقام پر ترمیم ہونی چاہئے۔ اس پر مولوی عبدالحئی، شاہ اسحاق صاحب، عبداللہ خاں علوی اور مومن خاں نے مخالفت کی اور کہا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں۔ اس پر آپس میں گفتگو ہوئی اور گفتگو کے بعد طے پایا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں اور اسی طرح شائع ہونی چاہئے۔ چنانچہ اسی طرح اس کی اشاعت ہوگئی۔[1]

تقویۃ الایمان

تقویۃ الایمان کا مرکزی موضوع خدا کی وحدت ہے اس میں شاہ شہید نے مسلمانوں کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کے نزدیک ساری برائیوں کی جڑ شرک ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی پستی اور ان کے زوال کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ان کے عقائد و اعمال میں شرک کا غلبہ ہو گیا ہے اور وہ توحید کے بنیادی تصور سے بالکل غافل ہو گئے ہیں، چنانچہ تقویۃ الایمان میں فرماتے ہیں۔

"اول سنا چاہئے کہ شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل

---

[1] ارواح ثلاثہ ص ۸۰

توحید نایاب ہے اور اکثر لوگ شرک و توحید کے معنی نہیں سمجھتے اور ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں حالانکہ شرک میں گرفتار ہیں اوّل معنی شرک و توحید کے سمجھنا چاہئیں تاکہ برائی اور بھلائی ان کی، قرآن و حدیث سے معلوم ہو"۔[1]

تقویۃ الایمان کا پہلا باب "توحید و شرک کے بیان میں" ہے۔ اس میں جو مباحث بیان کئے گئے ہیں، ان کا خلاصہ ڈاکٹر محمد باقر کے الفاظ میں۔

"ان کا (شاہ اسماعیل شہید کا) خیال تھا کہ مسلمانوں میں کفار و مشرکین کی وجہ سے جو رسوم اور بدعات پیدا ہو گئی ہیں انھوں نے ہندوستان میں اسلامی زندگی کی بنیادیں متزلزل کر دی ہیں جس سے مسلمانوں کی ملی زندگی ختم ہونے کا اندیشہ ہے، ان بدعات میں سے ان کے نزدیک مندرجہ ذیل بہت اہم تھیں، مثلاً مرشدوں کی ضرورت سے زیادہ تعظیم و تکریم، مقبروں پر نذریں اور چڑھاوے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں نے بھی اپنے مرشدوں کو وہی درجہ دے دیا ہے جو ہندوؤں نے اپنے گروؤں کو دے رکھا ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک کے برعکس ہندوستان میں اسلام اور کفر کی کھچڑی پک رہی ہے اگر ہندو متھرا، کاشی اور گیا کے شہروں کو مقدس قرار دیتے ہیں تو مسلمان اجمیر بہرائچ اور ملکھن پور کو مقدس سمجھتے ہیں، اگر ہندو اپنے بتوں کے لئے مٹھ تعمیر کرتے ہیں تو مسلمان بھی مقبرے بناتے ہیں، مٹھوں میں جنت اور گوسائیں موجود ہیں تو مقبروں میں خادم مجاور اور پیرزادے موجود ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بزرگوں سے منتیں مانگی جاتی ہیں اولاد کے لئے ان سے دعا کی جاتی ہے اپنی مشکلات کا حل تلاش کیا جاتا ہے

---

[1] تقویۃ الایمان ص ۱۔

وغیرہ وغیرہ۔ ان کی قسمیں کھانا، ان کے نام کی نذریں اور قربانیاں دینا گناہ ہے۔ چنانچہ اولاد پیدا ہونے کے بعد ان کے ایسے نام رکھنا غلط ہے جن سے ظاہر ہو کہ یہ پیروں، فقیروں کی مہربانی سے حاصل ہوئے ہیں۔ مثلاً نبی بخش، امام بخش۔ عبد النبی۔ بندے علی وغیرہ وغیرہ"[1]

اور اپنا وکیل اور دافع ہر بلا جانتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں میں جو ایسے غلط عقائد رواج پا گئے ہیں وہ دراصل ان ہی عقائد سے ماخوذ ہیں۔ شرک صرف یہی نہیں ہے کہ کسی غیر اللہ کو اللہ کے ہم پلہ قرار دیا جائے بلکہ ایسے اعمال اور عقائد سے بھی شرک وارد ہو جاتا ہے جن سے ان کا صاحب تصرف ہونا ثابت ہو یا ان صفات کا حامل ہونا ظاہر ہوتا ہو جو اللہ نے خاص اپنے واسطے مخصوص رکھی ہیں۔

"یعنی اللہ کو تو بڑا مالک سمجھتے ہیں اور اس سے چھوٹے اور مالک ٹھہراتے ہیں مولویوں اور درویشوں کو، سو اس بات کا ان کو حکم نہیں ہوا اور اس سے ان پر شرک ثابت ہوتا ہے اور وہ نرالا ہے اس کا شریک کوئی نہیں ہو سکتا۔ نہ چھوٹا نہ برابر کا بلکہ چھوٹے بڑے سب اس کے بندۂ عاجز ہیں، عجز میں برابر"[2]

شاہ صاحب نے پہلے، شرک کی چار قسمیں بتائی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اشراک فی العلم۔
۲۔ اشراک فی العبادت
۳۔ اشراک فی التصرف
۴۔ اشراک فی العادت

پھر علاحدہ علاحدہ ذیلی عنوان قائم کر کے ان چاروں کی وضاحت کی ہے ان کی برائیوں کی تشریح کی ہے اور ان سے اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے۔ ان کی توضیح اس

---

[1] عبد اللہ بٹ (مرتب): "شاہ اسماعیل شہید" ص ۵۶، ۵۷۔ [2] تقویۃ الایمان ص ۷

اندازمیں کی ہے۔

(۱) اشراک فی العلم : اس کا مطلب ہے کہ اللہ کے علم میں کسی دوسرے کو شریک کرنا یعنی کسی مشکل، مصیبت یا زبردست مہم میں اللہ کے بجائے کسی بندے کو یاد کرنا چاہے پیر ہو، مرشد ہو ولی اللہ ہو یا انبیاء علیہم السلام میں سے کوئی ہو۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کسی مشکل کام میں "یا علی مدد" کہہ کر لوگ مہم کا آغاز کرتے ہیں۔ اسی طرح کسی مصیبت کے وقت "یا عبدالقادر" یا "یا غلام دستگیر مدد" کہا جاتا ہے ایسی تمام باتیں شرک ہیں اور یہ اشراک فی العلم کے زمرے میں آتی ہیں۔ اس کی تشریح شاہ صاحب کے الفاظ میں:

"جو کوئی کسی کا نام اٹھتے بیٹھتے لیا کرے اور دور و نزدیک سے پکارا کرے اور بلا کے مقابلے میں اس کی دہائی دیوے اور دشمن پر اسی کا نام لے کر حملہ کرے اور اس کے نام کا ختم پڑھے یا شغل کرے یا اس کی صورت کا خیال باندھے اور یوں سمجھے کہ جب میں اس کا نام لیتا ہوں زبان سے یا دل سے اس کی صورت کا یا اس کی قبر کا خیال باندھتا ہوں تو وہیں اس کو خبر ہو جاتی ہے اور اس سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اور اور جو مجھ پر احوال گزرتے ہیں جیسے بیماری، تندرستی، کشائش و تنگی، مرنا و جینا، غم و خوشی، سب کی ہر وقت اسے خبر ہے اور جو بات میرے منہ سے نکلتی ہے وہ سب سن لیتا ہے اور جو خیال و وہم میرے دل میں گزرتا ہے وہ سب سے واقف ہے سو ان باتوں سے شرک ہو جاتا ہے اور اس قسم کی باتیں سب شرک ہیں"[1]

شرک کی تعریف کرتے ہوئے شاہ اسماعیل شہید لکھتے ہیں۔

---

[1] ایضاً ص ۸

"سننا چاہیئے کہ اکثر لوگ پیروں اور پیغمبروں اور اماموں کو اور شہیدوں کو اور فرشتوں کو اور پریوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور حاجت برائی کے لئے ان کی نذر و نیاز کرتے ہیں اور بلا کے ٹلنے کے لئے اپنے بیٹوں کو ان کی طرف نسبت کرتے ہیں ..... غرض جو کچھ ہندو اپنے بتوں سے کرتے ہیں سو وہ سب کچھ یہ جھوٹے مسلمان اولیاء اور انبیاء سے اور اماموں اور شہیدوں سے اور فرشتوں اور پریوں سے کر گزرتے ہیں اور دعویٰ مسلمان کا کئے جاتے ہیں۔ سبحان اللہ یہ منہ اور یہ دعویٰ [1]

مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"اگر لوگ جو دعویٰ ایمان کا رکھتے ہیں سو وہ شرک میں گرفتار ہیں پھر اگر کوئی سمجھانے والا ان لوگوں سے کہے کہ تم دعویٰ ایمان کا رکھتے ہو اور افعال شرک کے کرتے ہو، سو یہ دونوں راہیں ملائے دیتے ہو۔ اس کا جواب دیتے ہیں کہ ہم شرک نہیں کرتے بلکہ اپنا عقیدہ انبیاء و اولیا کی جناب میں ظاہر کرتے ہیں [2]

مسلمانوں کا ایک عام عقیدہ یہ ہے کہ اولیاء کرام، اللہ کے مقرب بندے ہوتے ہیں اس لئے ان سے مدد طلب کرنا اللہ ہی سے مدد طلب کرنا ہے اور اللہ سے قریب ہونے کے سبب، وہ ہماری سفارش اور وکالت بھی کر سکتے ہیں۔ شاہ اسماعیل شہید اس عقیدے کی بڑی تردید کرتے ہیں ان کا فرمانا ہے کہ عوام نے مسئلہ کی روح کو نہیں سمجھا اور اس سے متعلق قرآن و حدیث کی تعلیمات پر غور نہیں کیا بلکہ اپنی عقل کے سہارے

---

[1] تقویۃ الایمان ص ۵
[2] ایضاً ص ۵

غلط رسموں کو پکڑتے رہے اور جھوٹی کہانیوں کو سچا تصور کر کے طرح طرح کے خرافات بکتے رہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ:

"شرک جب ہوتا کہ ہم ان انبیاء و اولیاء کو اور پیروں شہیدوں کو اللہ کے برابر سمجھتے سو یوں تو ہم نہیں سمجھتے بلکہ ہم ان کو اللہ ہی کا بندہ جانتے ہیں اور اسی کا مخلوق اور یہ قدرت تصرف اسی نے ان کو بخشی ہے اس کی مرضی سے عالم میں تصرف کرتے ہیں اور ان کا پکارنا عین اللہ ہی کا پکارنا ہے اور ان سے مدد مانگنی عین اسی سے مدد مانگنی ہے اور وہ لوگ اللہ کے پیارے ہیں جو چاہیں سو کریں۔ اور اس کی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں اور وکیل۔ ان کے ملنے سے خدا ملتا ہے اور ان کے پکارنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور جتنا ہم ان کو جانتے ہیں اتنا اللہ سے ہم نزدیک ہوتے ہیں"[1]

شاہ شہید نے اس نظریہ کی پرزور مذمت کی ہے کہ اللہ نے اپنے مقرب بندوں کو تصرف کی قدرت عطا کی ہے اور یہ اس کی مرضی سے دنیا میں تصرف کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اللہ نے تصرف کی قدرت کسی کو بھی عطا نہیں کی۔ اس لئے ہر شخص اللہ کے آگے عاجز ہے اور کسی طرح کے بھی تصرف پر قادر نہیں ہے۔ یہ رسم کفار مکہ میں بھی رائج تھی وہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہم بتوں کو خدا کی مخلوق تصور کرتے ہیں مگر ان کو محض صاحب تصرف۔

اسی قسم کے مشرکانہ افعال و عقائد سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ گناہوں میں سب سے بڑا اور قبیح گناہ شرک ہے، اللہ بندوں کے تمام گناہ بخش دے گا لیکن شرک کی معافی کسی طرح نہ ہوگی۔ جامع ترمذی میں ایک حدیث

---

[1] ایضاً ص ۸

قدسی ہے[1]

عن انس قال قال رسول اللہ	حضرت انس سے روایت ہے کہ حضور
صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ تعالیٰ	اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ
یا ابن آدم انک لو لقیتنی بقراب	نے فرمایا کہ اے آدم کے بیٹے بیشک
الارض خطایا ثم لقیتنی لا	تو جو مجھ سے ملے دنیا بھر کے گناہ لے کر
تشرک بی شیئاً لاتیتک	پھر ملے مجھ سے کہ نہ شریک سمجھتا ہو میرا
بقرابہا مغفرۃ	کسی کو تو بے شک لے آؤں میں تیرے
	پاس بخشش اپنی۔

اس حدیث قدسی سے صاف ظاہر ہے کہ شرک کے علاوہ تمام گناہ اللہ تعالیٰ بخش دے گا لہٰذا انسان کو ہر وقت شرک سے بچتے رہنا چاہیئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"یہ جان لینا چاہیئے کہ جس کی توحید کامل ہے اس کا گناہ وہ کام کرتا ہے کہ اوروں کی عبادت وہ کام نہیں کر سکتی۔ فاسد موحد ہزار درجہ بہتر ہے متقی مشرک سے۔"[2]

۲۔ اشراک فی التصرف: شرک کی دوسری قسم اشراک فی التصرف ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی تعظیم کی مستحق ذات باری تعالیٰ ہے، ساری کائنات پر اسی کا حکم چلتا ہے۔ وہی زندگی بخشتا اور مارتا ہے وہی بیماروں کو شفا عطا کرتا ہے، وہی فتح و شکست دیتا ہے اور وہی پریشانیوں سے نجات دلاتا ہے۔ یہ تمام خصوصیات صرف خدا کی ذات ہی سے وابستہ ہیں، ان میں غیر اللہ کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اگر کوئی شخص ان خصوصیات میں سے کسی بھی خصوصیت کا حامل کسی غیر اللہ کو تصور کرتا ہے تو وہ اشراک

---

[1] تقویۃ الایمان ص ۱۵، ۱۶ [2] ایضاً ص ۱۶

فی التصرف کے گناہ میں مبتلا ہے۔ شاہ صاحب اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں: ۔

"دوسری بات یہ ہے کہ علم میں ارادے سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا اور اپنی خواہش سے مارنا اور جلانا، روزی کی کشائش اور تنگی کرنا اور تندرست و بیمار کر دینا، فتح و شکست دینی اقبال و ادبار دینا، مرادیں پوری کرنی حاجتیں برلانی بلائیں ٹالنی مشکل میں دستگیری کرنی برے وقت میں پہنچنا، یہ سب اللہ ہی کی شان ہے اور کسی انبیاء اور اولیاء کی پیر و مرشد کی بھوت و پری کی یہ شان نہیں جو کوئی کسی کو ایسا تصرف کرے اس سے مرادیں مانگے اور اس توقع پر نذر و نیاز کرے اور اس کی منتیں ملنے اور اس کو مصیبت کے وقت پکارے سو وہ مشرک ہو جاتا ہے اور اس کو اشراک فی التصرف کہتے ہیں"[1]

۳۔ اشراک فی العبادت : اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی عبادت میں غیر اللہ کو شامل کرنا اور جیسی تعظیم صرف اللہ کے لئے سزاوار ہے ویسی ہی تعظیم غیر اللہ کی بھی کرنا ہر قسم کی عبادت صرف اللہ کے لئے ہے، اس ہی کو سجدہ کرنا، اسی سے حاجت طلب کرنا اور اسی کو ملجا و ماویٰ سمجھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ بندوں سے کوئی توقع رکھنا شرک ہے۔ عوام، بزرگوں اور اولیاء کی قبروں پر جا کر سجدہ کرتے ہیں، منتیں مانتے ہیں، مزارات کے غلاف پکڑ کر دعائیں کرتے ہیں اور قبروں کو بوسہ دیتے ہیں۔ شیخ الحدیث عبدالحق محدث دہلوی کا فرمانا ہے کہ قبروں کو بوسہ دینے کی روش نصاریٰ کی ایجاد کردہ اس طرح قبروں کو بوسہ دینا مشرکانہ عمل کے ساتھ ساتھ بدعت نصاریٰ کی پیروی بھی ہے لہٰذا اور بھی زیادہ قبیح عمل ہوا۔ اسی طرح بزرگوں کے سامنے ہاتھ

---

[1] تقویۃ الایمان ص ۹

باندھ کر کھڑا ہونا اور ان سے رخصت ہوتے وقت الٹے پاؤں چلنا تاکہ ان کی طرف پشت نہ ہو، یہ تمام اعمال بھی مشرکانہ ہیں اور یہ اشراک فی العبادت کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"بعضے کام تعظیم کے اللہ نے اپنے لئے خاص کئے ہیں کہ ان کو عبادت کہتے ہیں جیسے سجدہ، رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا اور اس کے نام پر مال خرچ کرنا اور اس کے نام کا روزہ رکھنا اور اس کے گھر کی طرف دور دور سے قصد کر کے سفر کرنا اور ایسی صورت بنا کے چلنا کہ ہر کوئی جان لے کہ یہ لوگ اس گھر کی زیارت کو جاتے ہیں.... ..... یہ سب کام اللہ نے اپنی عبادت کے لئے اپنے بندوں کو بتائے ہیں، پھر جو کوئی کسی پیر و پیغمبر کو یا بھوت و پری کو یا کسی سچی قبر کو یا جھوٹی قبر کو یا کسی کے تھان کو یا کسی کے چلے کو یا کسی کے مکان کو یا کسی کے تبرک کو یا نشان کو یا بت کو سجدہ کرے یا رکوع کرے یا اس کے نام کا روزہ رکھا یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہووے یا جانور چڑھاوے یا ایسے مکانوں میں دور دور سے قصد کر کے جاوے یا وہاں روشنی کرے، غلاف ڈالے، چادر چڑھاوے، یا ان کے نام کی چوٹی کھڑی کرے رخصت ہوتے وقت الٹے پاؤں چلے، ان کی قبر کو بوسہ دیوے مورچھل جھلے، چوکھٹ کو بوسہ دیوے، ہاتھ باندھ کر التجا کرے اور اسی قسم کی باتیں کرے تو اس پر شرک ثابت ہوتا ہے اس کو اشراک فی العبادت کہتے ہیں"[1]

۴۔ اشراک فی العادت: شرک کی چوتھی قسم اشراک فی العادت ہے یعنی

---

[1] تقویت الایمان ص ۹

اپنی عادت کے کاموں میں جیسی تعظیم اللہ کی کرنی چاہیئے ویسی تعظیم غیر اللہ کی بھی کرنا۔ اس میں کسی کا شگون لینا نذر و نیاز چڑھانا، اپنے مقصد برابری کے لئے کسی غیر اللہ کو وسیلہ یا ذریعہ بنانا، زندہ پیروں مردہ ولیوں کی ایسی عزت و تکریم کرنا جس سے ان کا مرتبہ اللہ کے مرتبے کے برابر ہو جائے، اپنے اولاد کے نام اپنے پیر و مرشد کے نام پر اس طرح رکھنا جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ ان ہی کی دین ہے اور ان ہی کی توجہات خصوصی کا نتیجہ ہے مثلاً علی بخش، عبدالنبی، نذر حیدر، عبدالعلی۔ فقیر محمد وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے تمام اعمال و عقائد اشراک فی العادت کے زمرے میں آتے ہیں۔ اسی طرح غیر اللہ کی قسم کھانا بھی اشراک فی العادت میں شامل ہے۔ شاہ صاحب اس کی توضیح اس طرح کرتے ہیں

"چوتھی بات یہ ہے کہ اللہ صاحب نے اپنے بندوں کو سکھایا ہے کہ اپنی دنیا کے کاموں میں اللہ کو یاد رکھیں اور اس کی کچھ تعظیم کرتے رہیں تاکہ ایمان بھی درست رہے اور ان کاموں میں بھی برکت ہووے۔ جیسے آڑے کام پر اللہ کی نذر ماننی اور مشکل کے وقت اس کو پکارنا اور ہر کام کا شروع اس کے نام سے کرنا اور جب اولاد ہو تو اس کے شکر میں اس کے نام کا جانور ذبح کرنا اور اس کا نام عبداللہ، عبدالرحمان، خدا بخش، اللہ دیا، امۃ اللہ، اللہ دی رکھنا۔ اور کھیت اور باغ میں سے تھوڑا بہت اس کے نام کا رکھنا اور دھن ریوڑ میں سے کچھ اس کی نیاز کر رکھنا..... اس کے نام کو ایسی تعظیم سے لینا کہ جس میں اس کی مالکیت نکلے اور اپنی بندگی جیسے یوں کہنا ہمارا رب ہمارا مالک ہمارا خالق اور کلام میں جب قسم کھانے کی حاجت ہو تو اسی کے نام کی قسم کھانی سو اس قسم کی چیزیں اللہ نے اپنی تعظیم کے لئے بتائی ہیں پھر جو کوئی کسی انبیاء و اولیاء کی اماموں اور شہیدوں کی بھوت و پری کی اس قسم کی تعظیم کرے..... اولاد کا نام عبدالنبی، امام بخش رکھے..... جب حاجت قسم کھانے کی پڑے

تو پیغمبر کی یا علی یا امام کی، یا پیر کی یا ان کی قبروں کی قسم کھاوے۔ سو ان سب باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے اور اس کو اشراک فی العادت کہتے ہیں [1]

شرک کے علاوہ ایک اور اہم مسئلہ کلام اللہ اور حدیث سے متعلق تھا۔ اس زمانے میں ایک عام خیال یہ تھا کہ اللہ کے کلام کو صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرح احادیث بھی عام ذہن کی رسائی سے بالاتر ہیں۔ شاہ صاحب نے اس نظریئے کی بھی پرزور تردید کی ہے اور کہا کہ خدا نے تو گمراہ اور جہالت میں مبتلا دنیا کی رہنمائی کے لئے رسول کو بھیجا، پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کی باتیں ان ہی لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں جن کی ہدایت کا کام اسے تفویض کیا گیا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ دو بنیادی اصولوں کو نظر میں رکھا جائے ایک خدا کی وحدت اور دوسرے رسول پر ایمان کا یقین اکثر حضرات محض بزرگوں کے اقوال کو اپنا رہبر بنا لیتے ہیں حالانکہ ہمارے لئے صرف خدا کے احکام کافی ہیں۔ بزرگوں کے صرف وہی اقوال اور تحریریں قابل قبول ہیں جو قرآن و حدیث سے مطابقت رکھتی ہوں بقیہ ایسے تمام افعال و اقوال سے اجتناب کرنا چاہیئے جو خدا کے احکام قرآنی تعلیمات اور حدیث و سنت پر پورے نہ اترتے ہوں چاہے وہ کتنے ہی بڑے پیر یا مولوی سے منسوب ہوں اس لئے ضروری ہے کہ ہم قرآن کے مفاہیم اور حدیث کے مطالب سمجھنے کی کوشش کریں تاکہ اسلام کی صحیح تعلیمات سے واقفیت ہو جائے اور اس فرضی نظریہ کو یکسر ختم کر دینا چاہیئے کہ قرآن و حدیث کے مفاہیم عام فہم سے بالاتر ہیں۔ شاہ صاحب نے دیباچے میں اس مسئلہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہ جو عوام الناس میں مشہور ہے کہ اللہ و رسول کا کلام سمجھنا

---

[1] تقویۃ الایمان ص ۹، ۱۰

بہت مشکل ہے اس کو بڑا علم چاہئے۔ ہم کو وہ طاقت کہاں کہ ان کا کلام سمجھیں اور اس راہ پر چلنا بڑے بزرگوں کا کام ہے۔ سو ہماری کیا طاقت ہے کہ اس کے موافق چلیں بلکہ ہم کو یہی بات کفایت کرتی ہیں۔ سو یہ بات بہت غلط ہے اس واسطے کہ اللہ صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں باتیں بہت صاف اور صریح ہیں ان کا سمجھنا مشکل نہیں چنانچہ سورہ بقرہ میں فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ	اور بے شک اتاریں ہم نے طرف
اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ وَمَا	تیرے باتیں کھلی اور منکر اس سے
يَكْفُرُ بِهَا اِلَّا الْفَاسِقُوْنَ	وہی ہوتے ہیں جو لوگ بے حکم ہیں[1]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ اللہ کی بڑی نعمت ہے کہ اس نے ایسا رسول بھیجا کہ اس نے بے خبروں کو خبردار کیا اور ناپاکوں کو پاک اور جاہلوں کو عالم اور احمقوں کو عقلمند اور راہ بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ پر سو جو کوئی یہ آیت سن کر پھر یہ کہنے لگے کہ پیغمبر کی بات سوائے عالموں کے کوئی سمجھ نہیں سکتا اور ان کی راہ سوائے بزرگوں کے کوئی چل نہیں سکتا سو اس آیت کا انکار کیا اور اس نعمت کی قدر نہ سمجھی بلکہ یوں کہا جائے کہ جاہل لوگ ان کا کلام سمجھ کر عالم ہو جاتے ہیں اور اگر راہ لوگ ان کی راہ پر چل کر بزرگ بن جاتے ہیں ..... سو ہر خاص و عام کو چاہئے کہ اللہ اور رسول ہی کے کلام کو تحقیق کریں اور اس کو سمجھیں اور اسی پر چلیں اور اسی کے موافق اپنے ایمان کو ٹھیک کریں"[2]

اس کے ساتھ توحید پر یقین کامل اور سنت کی اتباع کا درس دیتے ہیں۔

---

[1] تقویۃ الایمان ص ۳ [2] ایضاً ص ۴

آپ کے نزدیک یہ دونوں چیزیں ہی انسان کو اصل ایمان پر قائم رکھتی ہیں، شرک اور بدعت ایمان میں رخنہ ڈال دیتی ہیں اور ساری عبادت کو کھا جاتی ہیں۔ شاہ صاحب نے ان سے باز رہنے کی تلقین ان الفاظ میں کی ہے۔

"ہر کسی کو چاہیئے کہ توحید اور اتباع سنت کو خوب پکڑے اور شرک و بدعت سے بہت بچے کہ یہ دو چیزیں اصل ایمان میں خلل ڈالتی ہیں اور باقی گناہ ان سے پیچھے ہیں کہ وہ اعمال میں خلل ڈالتے ہیں اور چاہیئے کہ جو کوئی توحید اور اتباع سنت میں بڑا کامل ہو اور شرک و بدعت سے بہت دور اور لوگوں کو اس کی صحبت سے یہ بات حاصل ہوتی ہو اسی کو اپنا پیر و استاد سمجھے[1]"

مجموعی طور پر شاہ صاحب کا انداز بیان بڑا واضح اور مدلل ہے جو مباحث بھی اٹھائے ہیں ان پر صرف قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور ہر عقیدے کی تشریح قرآن و سنت کی روشنی میں کی گئی ہے۔ انداز بیان میں متانت اور سنجیدگی ہے اور انداز عالمانہ ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ خیالات میں سختی ہے اور مباحث میں کہیں لچک دکھائی نہیں دیتی، مصالحتی انداز نہیں ہے جس کی وجہ سے عوام پر اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا اور جلد ہی یہ کتاب لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو گئی۔

---

[1] تقویۃ الایمان ص ۴

انسان اور اس کے مسائل

سید جلال الدین عمری ——— قیمت ۳ روپے

انسان کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟ ان مسائل کو اسلام نے کس طرح حل کیا ہے؟ اور موجودہ دور اس حل کو قبول کرنے کے لئے کیوں نہیں آمادہ ہے؟ یہ کتاب ان ہی سوالات کا جواب دیتی ہے۔

ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

سیر و سوانح

ہشام کی سیاسی حکمت عملی

اموی انتظامیہ کا ایک جائزہ

ڈاکٹر عبد الباری

حضرت عثمانیؓ سے پہلے خاندان بنی امیہ میں حضرت معاویہ بن سفیانؓ اور عبد الملک بن مروان دو اہم مدبرین سیاست مانے جاتے ہیں۔ نظم مملکت کی سیاسی پالیسیوں کے نفاذ میں ان دونوں حکمرانوں کو شاہی گھرانے اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کا مکمل اعتماد حاصل رہا۔

حضرت عمر ثانیؒ نے سابقہ اموی حکمرانوں کی سیاسی پالیسیوں سے انحراف کرتے ہوئے نظم مملکت میں ملوکیت سے پیدا شدہ بگاڑ کی اصلاح چاہی اور ایک نئی سیاسی پالیسی کی بنیاد رکھی تاکہ اسلامی مملکت کے سربراہ کو پھر سے سیاسی قیادت کے ساتھ ساتھ دینی قیادت بھی حقیقی معنوں میں حاصل ہو۔ سیاست کے اس نئے موڑ نے جہاں احیائے دین کی شکلیں پیدا کیں وہیں شاہی گھرانے کے افراد اور خاندان بنی امیہ کے بعض بہی خواہ اعلیٰ افسروں میں خلیفۂ وقت کے خلاف جذبات بھی بھڑکائے۔

حادثات زمانہ کو کیا کہئے کہ تقریباً دو ڈھائی سال کے قلیل عرصے میں تطہیر و ترویج دین کا جو کام حضرت عمر ثانی نے اپنی قیمتی جان کی قربانی پیش کر کے انجام دیا تھا یزید ثانی نے ان کے بعد اپنے چار سالہ دور حکمرانی میں اس کے تار و پود بکھیر دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس اصلاح و تطہیر کی زد میں بیشتر شاہی گھرانے کے افراد اور انتظامیہ

کے اعلیٰ افسران آئے۔ چنانچہ انہیں افراد کا ایک بڑا طبقہ کھل کر اور پس پردہ بھی اصلاح کی اس تحریک کے خلاف صف آرا ہوا۔ یزید ثانی کے دور اقتدار میں اس طبقہ کی نہ صرف جیت ہوئی بلکہ انھیں اپنی من مانی کرنے کے مزید مواقع بھی میسر آئے۔ خلیفۂ وقت کی دلچسپی امور مملکت سے کم ہوئی اور عیش و نشاط کی محفلیں زیادہ گرم ہونے لگیں تو ان عناصر کے حوصلے بڑھ گئے جو دین سے ہٹ کر گمراہیوں میں مبتلا تھے اور صحیح عقائد کی جگہ بدعات اور زندیقیت کی پیروی کر رہے تھے۔ وہ سیاسی عہدے دار جو اموی حکومت کے دست و بازو تھے یزید ثانی کی ذاتی پرخاش کی خاطر شدید انتقامی ردعمل کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسیوں سے بدظن ہوئے اور بغاوت کی حد تک جا پہنچے۔ یزید بن مہلب کی بغاوت اسی نوعیت کی تھی۔ خلیفہ کی کمزوریوں کا اندازہ کرتے ہوئے عباسی پروپیگنڈے کی وہ تحریک بھی جس کا مقصد بنو امیہ کو اقتدار سے بے دخل کرنا تھا، تیز تر ہو گئی۔ مشرق میں سندھ سے لے کر مغرب میں اسپین تک شورشوں کا ایک سیلاب اٹھ کھڑا ہوا۔

اسلامی مملکت داخلی اور خارجی دونوں حیثیتوں سے ایک بڑے بحران سے دوچار تھی۔ ظہور اسلام کے سو سال پورے ہو چکے تھے۔ خاندان بنی امیہ نے بھی حکمرانی کے چالیس سال گزار لئے تھے۔ بہت ساری قوموں کے اختلاط، مختلف مذہبی و سیاسی آرا کے ٹکراؤ، علوم و ثقافت کی ترقی، بیرونی خطرات اور اندرونی خانہ سیاسی اقتدار کی کشمکش نے نئے مسائل اور نئے اندیشے پیدا کر دیئے تھے۔ ایسے نازک مرحلے میں اسلامی مملکت کی سربراہی کا بار ہشام بن عبدالملک کے کاندھوں پر آیا سابقہ حکمرانوں کے مقابلے میں اس کے سیاسی تدبر کا امتحان یوں زیادہ سخت ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی پالیسیوں کے نفاذ میں حضرت معاویہؓ اور عبدالملک کے عہد کی سی شاہی گھرانے کی یکجہتی اور بہی خواہ عہدہ دارانِ سلطنت کی مکمل اور پرخلوص حمایت میسر نہ تھی۔

ہشام بن عبدالملک (۱۰۵ — ۱۲۵ھ) خاندان بنو امیہ کا دسواں حکمراں تھا۔ وہ ایک اولوالعزم، باتدبیر اور اسلام پسند سربراہ مملکت تھا۔ مسعودی کا کہنا ہے

کہ خاندان بنی امیہ میں حضرت معاویہؓ، عبدالملک بن مروان اور ہشام بن عبدالملک جیسی سوجھ بوجھ والا کوئی دوسرا نہیں ملتا۔ ان کی حیثیت اموی خاندان کے تین مستحکم ستونوں کی ہے[1]۔ اموی حکمرانوں میں حضرت معاویہؓ کو چھوڑ کر ہشام کے علاوہ کوئی دوسرا سربراہ مملکت اتنی طویل مدت تک کامیاب طریقے پر حکومت کا نظم نہیں چلا سکا۔ ابن قتیبہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ہشام کے دور اقتدار میں اسلامی سلطنت کا کوئی علاقہ بھی اس کی کنٹرول سے باہر نہ رہا[2]۔ یعقوبی کے مطابق اموی حکمرانوں میں ہشام سب سے زیادہ محتاط گزرا ہے[3]۔ سخت ترین نامساعد حالات میں بھی اس نے اسلام دشمن بیرونی طاقتوں، خصوصیت سے رومن امپائر (ROMAN EMPIRE) کے مقابلے میں، اپنی بات اور ساکھ کو نیچا ہونے نہ دیا، حالانکہ اموی دور اقتدار میں ہی ایک وقت ایسا بھی گذر چکا ہے جب داخلی شورشوں سے پریشان ہو کر عبدالملک نے رومیوں کو ۳ ہزار دینار ہفتہ وار دینا منظور کر لیا تھا[4]۔

ہشام نے جس وقت زمام حکومت سنبھالی اس کے سامنے صرف اموی حکومت کو مستحکم کرنے، اندرونی خلفشار کو روکنے اور دینی امور کو فروغ دینے کی بات نہیں تھی بلکہ ایک پھیلی ہوئی اسلامی سلطنت، جو دنیا کی عظیم ترین مملکت بن چکی تھی، کے وجود و وقار کو باقی رکھنے اور بہتر طریقے پر چلانے کا مسئلہ تھا۔

سیاسی پالیسی کے بنیادی عناصر

سابقہ جلیل المرتبہ اموی حکمرانوں میں حضرت معاویہؓ اور عبدالملک بن مروان کی

---

[1] مسعودی : مروج الذہب، جلد ۳، صـ ۲۳۲
[2] ابن قتیبہ : الامامۃ والسیاسۃ، جلد ۲، صـ ۲۰۴
[3] یعقوبی : تاریخ الیعقوبی، صـ ۳۰۳
[4] خضری بک : محاضرۃ تاریخ الامم، جلد ۲، صـ ۳۳۹

سیاسی حکمت عملی اور حضرت عمر ثانی کی سیاسی پالیسیوں کے موافق اور مخالف اثرات ہشام کی نگاہوں کے سامنے تھے، اس نے غایت دانش مندی سے ایک ایسی متوازن اصلاحی پالیسی اپنانے کی کوشش کی جس میں دین کی بالادستی کا خاصہ لحاظ ملتا ہے۔ امور مملکت میں اس نے محتاط ترین پالیسی اپنائی، جوش سے زیادہ ہوش سے کام لیا اور انتقامی کارروائی اور خون خرابے سے اجتناب برتا۔ شائد اسی وجہ سے اس کے بڑے بھائی مسلمہ بن عبدالملک نے ایک مرتبہ اسے بزدل اور بخیل کہا تھا۔ لیکن ہشام کا جواب تھا۔ "میں تدبر آمیز بردباری اور درگزر سے کام لیتا ہوں"۔[1]

امور مملکت میں اصلاح حال کی جو کوششیں ہوئیں اس میں اس بات پر یقیناً زیادہ زور رہا کہ انتظامیہ کی مشینری نہ صرف صحیح رُخ پر کارکردگی کا مظاہرہ کرے بلکہ زیادہ سے زیادہ فعّال بھی ثابت ہو۔ چنانچہ ہشام نے داخلی اور خارجی دونوں امور کو پیش نظر رکھ کر نظم مملکت کا ایک جامع خاکہ بنایا اور اسے حکمت عملی سے بروئے کار بھی لایا۔

داخلی امور

مرکزی اقتدار کا استحکام

بنوامیہ کے دور اقتدار میں اسلامی مملکت انتظامی امور کی سہولت کی خاطر مختلف صوبوں میں منقسم تھی۔ ہر صوبے میں ایک وائسرائے یا عامل نظم وضبط کے سلسلے میں مختارِ کل ہوتا تھا۔ ہشام سے پہلے سیاسی حالات کچھ ایسے رہے کہ ان عمّال نے اپنے وسیع سیاسی اختیارات کا گاہے گاہے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ قبائلی عصبیت کے شکار ہوئے اور اس نتیجے میں اپنے مخالفین کے ساتھ، جو دوسرے قبائل سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے ظلم وزیادتی کی پالیسی اپنائی۔ مرکز سے دور دراز کے

---

[1] ابن الاثیر : الکامل، جلد ۵، ص ۱۹۵

صوبوں میں جب ان کے اثر و رسوخ بڑھے تو اپنی انا کی تسکین میں کبھی کبھی انھوں نے مرکز کے بعض احکامات کو پس پشت بھی ڈال دیا۔ خراسان کی گورنری کے زمانے میں مشہور قائد مسلم بن قتیبہ نے بھی ایک مرتبہ مرکز کے خلاف آواز اٹھانے کی بات کی تھی۔ عبداللہ بن زیاد نے معاویہ ثانی کی موت کے بعد جب مرکزی اقتدار میں اضمحلال کے آثار پائے تو اس کے دل میں بھی سربراہ مملکت بننے کا جذبہ بیدار ہوا تھا۔ ایک موقع پر عراق کے والی سے یزید بن مہلب کی من مانی بھی اتنی بڑھی کہ اس نے مال غنیمت کو مرکز تک پہنچانے کے بجائے ذاتی تصرف میں لے لیا تھا۔ مرکزی اقتدار کی کھلی پامالی اور سرکاری مال میں خرد برد کو دیکھتے ہوئے حضرت عثمانیؓ کو خاندان بنی امیہ کے اس بہی خواہ عامل اور مشہور قائد کو بھی جیل خانے تک پہنچانے پر مجبور ہونا پڑا۔ بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی۔ یزید ثانی کا دور آیا تو ابن مہلب نے کسی طرح جیل سے فرار ہو کر مرکز کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا مہلب گھرانے کی بہترین عسکری قوت جن کی حیثیت بنو امیہ کے دست و بازو کی تھی خود اموی اقتدار کے خلاف استعمال ہوئی۔

مرکزی اقتدار کو ایک دوسرا بڑا خطرہ قبائلی عصبیت کے بڑھتے ہوئے اثرات تھے سابقہ حکمرانوں کی پالیسیاں کچھ ایسی رہیں کہ اہم صوبوں کے عامل وقفے وقفے سے مضری اور یمنی قبائلی قبائل سے لے کر بنائے جاتے رہے۔ کسی صوبے میں اگر یمنی حاکم ہوتا تو مضریوں کو شکایت رہتی اور انھیں بہت سارے جائز حقوق سے بھی دست بردار ہونا پڑتا کبھی کبھی سیاسی اختلافات کی بنا پر انھیں ظلم و زیادتی کا ہدف بھی بننا پڑتا تھا۔ اس صورت حال نے سیاسی انتقام کی خاطر عمل اور ردعمل کا ایک لامتناہی سلسلہ دراز کر دیا۔ من حیث قبیلہ خاندانی شرف اور اثر و رسوخ کو ہی دیکھ کر خلیفۂ وقت صوبوں کے لئے عامل مقرر کرنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ صوبائی افسران اعلیٰ کے تقرر میں قبائلی طاقت کا لحاظ خلیفہ کی مرکزی پالیسی پر پوری طرح اثر انداز ہو چکا تھا۔ ہشام کی سیاسی بصیرت نے مرکزی اقتدار کو درپیش مستقبل کے خطرات کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے قبائلی عصبیت کو طاقت کا محور بننے سے روکا

اور عمال کی تقرری میں یمنی مضری طاقت کے بیلنس کی پالیسی ترک کرکے مرکزی اقتدار کی بالادستی قائم کی۔ عراق کے مشہور عامل خالد القسری (ھ ۱۰۵ — ۱۲۰ھ) کو کامیابی کے ساتھ معزول کرکے اس نے اس بات کا ثبوت فراہم کردیا کہ اس کے عہد میں کسی حجّاج کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے، عمّال کی معزولی اور کثرت سے ان کی تبدیلی کرکے اس نے طوائف الملوکی کے خطرات کا سدّباب کیا۔ خود اپنے بڑے بھائی مسلمہ کو اس نے الجزیرہ کی ولایت سے دو مرتبہ ہٹایا۔[1] المبرّد نے اپنی مشہور کتاب الکامل میں ہشام کا ایک سیاسی خط نقل کیا ہے جو عراق کے والئے سرائے خالد القسری کو تنبیہ اور سرزنش کی خاطر لکھا گیا تھا۔ اس خط سے ہشام کی سیاسی پالیسیوں کے وہ خطوط کھل کر سامنے آجاتے ہیں جن میں مرکزی اقتدار کی بالادستی اور قبائلی طاقت کے مقابلے میں خلیفۂ وقت کی مرضی و منشا کو بڑا بتایا گیا ہے۔[2]

انتظامی مشینری پر مکمل کنٹرول

حکومت کی انتظامی مشینری کا انحصار سب سے زیادہ صوبائی گورنروں اور ان کے ماتحتوں پر تھا۔ ہشام نے اپنی غیر معمولی توجہ بہتر افسران کی تقرری پر مبذول کی، اس نے بیشتر اعلیٰ کردار اور بہتر اخلاق والے اشخاص کا انتخاب کیا۔ ایک مرتبہ خراسان کے عامل کی بحالی مقصود تھی تو ہشام نے امیدوار کی اس حد تک چھان بین کی کہ آیا وہ رشوت خور تو نہیں یا لوگوں کی ملامت کا ہدف تو نہیں بنتا رہا ہے۔[3]

ہشام افسران کی تقرری کے بعد انھیں اپنی من مانی کرنے، سرکاری کاموں سے غفلت برتنے اور بہتر کردار و اخلاق سے بے پروا ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ ان کی کارکردگی

---

[1] زامباور : المعجم، ج ۲ ص ۲۷۱ — ۷۳
[2] مبرّد : الکامل، جلد ۳، ص ۱۲۷۹ — ۸۳
[3] دینوری : اخبار الطوال، ص ۳۴۲

کا جائزہ لیتا رہتا تھا اور گاہے گاہے انھیں سرزنش کرنے اور ہدایات بھیجنے کا کام بھی کرتا تھا۔ ہشام کی طرف سے خالد القسری کی تنبیہ میں بھیجے گئے۔ خط میں ان حدود و قیود کا پتہ چلتا ہے جن کے دائرے میں رہ کر ایک گورنر کو اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے[1]۔ خط میں اس بات کی وضاحت ہے کہ :۔

(۱) سربراہ مملکت کو عمال کی اصلاح و تربیت کا سب سے زیادہ حق ہے۔
(۲) گورنری کا انتخاب گھرانے کی اہمیت اور قبائلی شرف کی بنا پر نہیں ہوا ہے۔
(۳) مسلمانوں پر مجوسیوں اور عیسائیوں کو غالب نہیں کیا جا سکتا۔
(۴) رعایا پر ظلم و زیادتی سے متعلق گورنروں کے خراب رویے کی سخت نوٹس لی جائے گی۔
(۵) سرکاری افسروں کو عیش کوشی اور لہو و لعب میں پڑے رہنے کی اجازت نہیں ہوگی۔
(۶) سرکاری املاک اور خزانے کو بلا ضرورت ضائع کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔
(۷) بُرے اور نا اہل ماتحتوں کی تقرری پر افسر اعلیٰ کی گرفت ہوگی۔
(۸) سرکاری عہدے سے ذاتی منفعت اٹھانے اور آمدنی کا حساب کتاب ٹھیک نہ رکھنے پر سرزنش ہوگی۔
(۹) قبائلی عصبیت کو ہوا دینے کی اجازت نہیں ہوگی۔

سرکاری افسروں کی کارکردگی کو زیادہ فعّال بنانے کے لئے ہشام نے بڑے پیمانے پر سرکاری جاسوس مقرر کئے جن کا کام ان حکّام کی نگرانی اور ان کے اعمال و اقوال کی رپورٹ مرکز تک پہنچانا تھا۔ اس طرح وہ دور دراز کے افسروں کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور کاموں سے بخوبی آگاہ رہتا تھا[2]۔ اگر وہ کسی بھی افسر کو غلطی کا مرتکب پاتا تو اسے تنبیہ کے بغیر نہیں چھوڑتا

---

[1] مبرّد : الکامل، جلد ۲، صد ۲۷۱-۷۳
[2] ابن قتیبہ : الامامہ، جلد ۲، صد ۲۰۶

تھا۔ ابن کثیر کا کہنا ہے کہ مروانی خلفا میں سرکاری ملازمین کے فرائض منصبی کی سب سے بڑی نگرانی اور ان کے خلاف تحقیقات میں سب سے سخت ہشام ہی تھا[۳]

جہاں تک سرکاری دفاتر (دواوین) کا تعلق ہے، ہشام نے اپنے عہد میں کل سرکاری ریکارڈس کو عربی میں لکھنے کا انتظام مکمل کر لیا تھا۔ سرکاری کاغذات ہشام کے عہد میں سب سے زیادہ صحیح اور جدید ترین تصور کئے جاتے تھے[۴] دفاتر کی بہتر کارکردگی سے نوکر شاہی کے برے اثرات پر بھی بہت حد تک کنٹرول رہا۔

شاہی خاندان کے افراد سے سیاسی روابط

انتظامی امور میں ہشام نے شاہی گھرانے کے افراد کو بھی من مانی کرنے یا حکومت کے قوانین اور ضابطوں کی خلاف ورزی کرنے کی چھوٹ نہیں دی۔ ان افراد کو بھی اس نے یہ احساس دلانا چاہا کہ حکومت کی طرف سے انھیں کسی رعایت کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ اپنے لڑکے سعید کو اس نے حمص کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس کے فسق و فجور میں مبتلا ہونے کی خبریں جیسے ہی ملیں ہشام نے معزولی کا حکم صادر کر دیا[۵] اپنے دور حکمرانی میں ولی عہد سلطنت ولید بن یزید کو جو لہو و لعب اور فسق و فجور میں بہت زیادہ گرفتار تھا، ہر ممکن طریقے سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی، اس کی تنبیہ و اصلاح کا سلسلہ بیس سالوں تک چلتا رہا۔ ہشام چاہتا تو ولید بن یزید کو آسانی سے ولی عہدی سے ہٹا کر اپنے لڑکے کو جانشین بنا سکتا تھا لیکن ہشام نے اپنے کنبے کے افراد میں مزید خانہ جنگی اور سیاسی رسہ کشی کو پیدا ہونے سے حتی الامکان روکا۔ دارالخلافہ کو دمشق سے رصافہ لے جانے میں جہاں اور دوسری مصلحتیں

---

۳ ابن کثیر : البدایہ، جلد ۹، صہ ۳۵۳

۴ ابن کثیر : البدایہ، جلد ۹، صہ ۳۵۳

۵ العقد الفرید : ابن عبدالربہ، ج ۲ صہ ۱۴۸

بھی ہو سکتی ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہی گھرانے کے اثر و رسوخ کے بڑھتے ہوئے اثرات کو کم کرنے اور انتظامیہ کو زیادہ فعّال بنانے کی بات بھی بہت حد تک پیش نظر رہی ہوگی۔

مخالف سیاسی پارٹیوں سے معاملات

ہشام کو یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ اسلامی حکومت کی سیاسی قیادت بنو امیہ سے ہٹ کر کسی دوسرے گھرانے یا سیاسی پارٹی کی طرف منتقل ہو جائے، اسے ہر حال میں بنو امیہ کا اقتدار پیارا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے مخالف سیاسی آراء رکھنے والوں کے تئیں انتقامی کارروائی سے اجتناب کیا۔ بنو امیہ کے خلاف حضرت زید بن علی کا سیاسی موقف ہشام کو اچھی طرح معلوم تھا۔ لیکن اس کے باوجود، جب وہ سرکاری طور پر ماخوذ ہوئے تو ہشام نے عراق کے گورنر یوسف بن عمر کو یہ ہدایت دی کہ حلف لینے کے بعد انھیں گرفتار نہ کیا جائے[1] محمد بن علی کا بنو امیہ کے خلاف عباسیوں کے لئے خلافت کے لئے تحریک چلانا ہشام کو خوب معلوم تھا۔ لیکن جب وہ ہشام کے پاس پہنچے تو اس نے ان کے ساتھ برا سلوک کرنے کے بجائے اکرام کا مظاہرہ کیا اور تین ہزار درہم بھی قرض کی ادائیگی کے لئے دیا[2] مشہور شیعی شاعر الکمیت بن یزید کو اس نے اپنے بڑے بھائی کی سفارش پر معاف کر دیا تھا جب کہ وہ ہشام کے خوف سے تقریباً ۲۰ سال مخفی رہا تھا۔ خارجی فرقوں کے ساتھ ہشام کا سلوک البتہ بہت ہی سخت تھا۔ اس کی نگاہ میں ان کا جرم قابل معافی نہ تھا، کیونکہ وہ صرف گمراہیوں میں ہی مبتلا نہ تھے بلکہ مسلمانوں کے قتل کرنے میں بھی انھیں کوئی عار نہیں ہوتا تھا۔ ہشام نے ان کے خلاف اور دین میں بدعات

---

[1] ابو الفرج الاصبہانی : مقاتل الطالبین و اخبارہم، ص ۱۵۳

[2] مبرّد : الکامل ص ۵۷۵

کو داخل کرنے والوں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کی۔

دینی امور کی بالادستی

ہشام اسلامی اقدار کا پسند کرنے والا تھا مشہور مورخ ویلہوزن نے ہشام کو راسخ العقیدہ مسلمان بتایا ہے[۱] حضرت عمر ثانیؒ کی طرح اس نے بھی سب علیؓ سے گریز کیا[۲] کسی عالم دین کے ساتھ اس نے بدسلوکی کا برتاؤ نہیں کیا جہاں تک عدل و مساوات کا تعلق ہے اس نے ہمیشہ اپنے آپ کو دینی اقدار کا پابند رکھا اور کبھی بھی عدلیہ پر شاہی طاقت کا دباؤ نہیں ڈالا۔ ایک مرتبہ قاضی نے ہشام کے خلاف فیصلہ صادر کیا۔ ہشام نے بغیر کسی استکراہ کے اس فیصلے کو بسر و چشم قبول کر لیا[۳] کہا جاتا ہے کہ اس نے کسی شخص کی کوئی چیز بیت المال میں اس وقت تک نہیں رکھی جب تک اس چیز کے بارے میں چالیس افراد نے یہ گواہی نہ دے دی کہ اس کا مالک کوئی نہیں[۴] ہشام کی دینی حمیت اور کردار کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ عرب کے مشہور جوکر (JESTER) اشعب کو مدینے سے بلانے پر تیار ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے غیرت آئی اور مدینۃ الرسول سے ایک جوکر کا بلانا اسے گوارہ نہ ہوا[۵] اس سلسلے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اس نے فی البدیہہ یہ شعر کہا:

اذا لذت لم تعص الھوی قادك الھوی
الی کل ما فیه علیك مقال[۶]

---

۱ WELHAUZEN: ARAB KINGDOM

۲ مقریزی: الذہب المسبوک ص ۳۴

۳ ابن عبدالربہ: العقد، ج ۱، ص ۲۱

۴ ذہبی: تاریخ، ج ۵، ص ۱۷۱

۵ شذرات: العماد، ج ۱، ص ۱۶۵

۶ ابن کثیر: البدایہ ص ۲۵۱

اگر تم خواہشِ نفسانی کو لگام نہ دو گے تو وہ تمہیں ہر اس بات تک
پہنچائے گی جہاں لوگ تمہیں برا بتائیں گے۔

عوام سے بہتر رابطہ

مسعودی کے قول کے مطابق ہشام عوام کے مسائل سے غیر معمولی دلچسپی لیتا تھا[۱]۔ ابن قتیبہ کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے نئے دارالخلافہ رصافہ میں ۶۰ راتیں عوام کی شکائتیں سننے اور دادرسی میں گذارتا تھا[۲] دیہاتوں کے بدوی عرب بھی خاص طور پر اس سے ملتے اور اپنی ضروریات کو پیش کرتے تھے۔ وہ حتی الامکان ان کے مسائل کا حل نکالنے کی کوشش کرتا تھا[۳] حج کے موقع پر وہ علماء دین سے خصوصی ملاقاتیں کرتا تھا اور ان سے دین و اسلام کی باتیں سیکھتا تھا[۴]

عوامی فلاح و بہبود کی خاطر اس نے امن عامہ کا بہتر سے بہتر انتظام کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ اس دور کے اہم شعراء نے ہشام کے سیاسی نظم و ضبط اور امن عامہ کے بہتر انتظام کو مدحیہ قصائد میں بہت سراہا ہے۔ بنو امیہ کے مشہور شاعر جریر نے ہشام کی تعریف کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ خلیفۂ وقت نے وادیٔ بطحاء کے کل باسیوں کے لئے بہتر سیاسی نظم بہم پہنچایا ہے۔ ایک دوسری جگہ نئے دارالخلافہ رصافہ میں غیر معمولی امن عامہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دن تو دن رات کا سفر بھی رصافہ کی طرف امن و سلامتی کا ضامن ہوتا ہے[۵]

---

[۱] مسعودی : البینہ والاشراف ص ۲۷۹
[۲] ابن قتیبہ : الامامہ، ۲، ص ۲۰۱
[۳] احمد صفوت : مجمرہ خطب العرب ج ۳، ص ۲۷۳
[۴] محمود بن سلیمان : اعلام الاخبار، فولیو ۱۱۹
[۵] دیوان جریر : الصاوی

عمال کی طرف سے رعایا پر معمولی سی زیادتی کا علم ہونے پر ہشام ان کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرتا تھا[1] وہ مسلم رعایا کے ساتھ ساتھ غیر مسلم رعایا کا بھی پورا خیال رکھتا تھا۔ چنانچہ انطاکیہ میں عیسائی گرجے سے متعلق املاک جو ۴۰ سال سے ضبط چلی آتی تھیں، اس نے عیسائیوں کو واپس کر دیں[2]

خارجی امور

حدود مملکت کی بقاو حفاظت

ہشام نے جس وقت حکومت کی باگ ڈور سنبھالی مرکزی اقتدار میں اضمحلال اور داخلی شورشوں کی بنا پر وسیع و عریض اسلامی مملکت کے حدود کی بقاو حفاظت، وقت کا اہم ترین مسئلہ تھا۔

ہشام نے جہاں داخلی امور پر توجہ صرف کی وہیں خارجی امور سے بھی غیر معمولی دلچسپی لی۔ اس نے موجود حدود مملکت کو ہر قیمت پر باقی رکھنے (CONSOLIDATION) کی پالیسی اپنائی۔ اس سلسلے میں وہ دفاعی پیش قدمی کو بروئے کار لایا۔ حضرت عمر ثانیؒ نے محاذ جنگ سے اسلامی فوجوں کو واپس بلا لینا مناسب سمجھا تھا ہشام نے اسلامی سرحدوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لئے ہر اہم سرحدی محاذ پر اقدامی کارروائی کی اور دشمن کے حوصلوں کو پست بنا دیا۔ صرف خراسان اور ماوراء النہر کے علاقوں میں منگول قبائل اور صغدیوں کی جارحانہ کارروائیوں کو سدباب کرنے کی خاطر، ہشام کو لگاتار ۱۳ سالوں تک جنگ کا سلسلہ دراز رکھنا پڑا۔

براعظم یورپ پر ہشام کی پیش قدمی اتنی کارگر اور سخت تھی کہ جب ترکی اور فرانس

---

[1] مبرد : الکامل

[2] WELHOUSEN : ARAB KINGDOM & ITS FALL P.347

کے راستے بیک وقت دو طرف حملے ہوئے تو عیسائی حکمرانوں کے لئے حالات اس قدر سنگین ہو چکے تھے کہ مشہور انگریز مورخ گبن کو کہنا پڑا تھا:

"یورپ دو شعلوں کے درمیان گھر چکا تھا۔ اگر فرانس میں تور کی جنگ مسلمان جیت جاتے تو لوگ آکسفورڈ میں قرآن و حدیث کا درس ہوتے ہوئے دیکھتے۔"[1]

یہ جنگیں بیشتر دفاعی نوعیت کی تھیں۔ ان جنگوں سے ہٹ کر ہشام مختلف اطراف میں غیر ممالک سے بہتر سفارتی تعلقات کا بھی خواہاں تھا۔ تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے رومیوں، چینیوں اور ہندوستانی راجاؤں سے بہتر سفارتی تعلقات استوار کرنا چاہا اور خیر سگالی کے جذبات کا اظہار بھی کیا۔

اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ہشام کی سیاسی پالیسی کامیاب نظر آتی ہے۔

---

[1] THE HISTORY OF THE DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE : E. GILILEOE Vol. II P. 342

سید جلال الدین عمری کی تصنیف

عورت — اسلامی معاشرہ میں

عورت دور قدیم میں کیا تھی اور دور جدید میں کیا ہے؟ اسلام نے اسے کیا مقام عطا کیا یا کیا حقوق دیئے؟ اس کا کیا دائرہ کار متعین کیا؟ اجتماعی جد و جہد کی کہاں تک اجازت دی؟ جنسی تعلقات کو اسلام کس نظر سے دیکھتا ہے؟ اس سے متعلق مسائل کو اسلام کس طرح حل کرتا ہے؟ یہ ہیں بعض وہ موضوعات جن سے اس علمی اور تحقیقی کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

ہندوستان میں آٹھواں ایڈیشن صفحات ۴۳۲ قیمت ۱۲ روپے

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶ سے حاصل کریں

مولانا علی حسین عاصم بہاریؒ

کا اسلامی نظام تربیت

ڈاکٹر احمد سجاد

ہندوستان کو بعض لوگ مذاہب کا بحر مردار بھی کہتے ہیں، اس مبالغہ کی جزوی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ درجنوں مذاہب کا یہاں جو حشر ہوا وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مجددین و مصلحین کی کوششیں اگر جاری نہیں رہتیں تو خدا جانے خود اسلام کا اس ملک میں کیا حشر ہوتا مایا اور بھگتی کے اثر نے مربیانہ تصوف اور درن آشرم نے ذات پات اسی طرح تلک، جہیز اور مختلف قسم کی مشرکانہ رسوم کی مہلک بیماریوں نے اہل اسلام کو یہاں جس طرح متاثر کیا ہے وہ آج بھی سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ علی حسین عاصم بہاریؒ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اس میں ذات پات اور بدیشی راج کی سرپرستی میں زمینداروں کے ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا اس وقت کا مسلم سماج واضح طور پر دو حصوں میں منقسم تھا۔ اعلیٰ اور ادنیٰ اور ان دونوں کے درمیان کی خلیج ہر سطح پر روز بروز گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس مصنوعی گہری خلیج کو پاٹے بغیر کوئی اصلاحی کوشش برگ و بار نہیں لا سکتی تھی۔

مشیت نے عاصم بہاریؒ کو اعلیٰ تعلیم سے محرومی اور بعض کم مائیگیوں کے باوجود اس خلیج کو پاٹنے کی پوری صلاحیت بخشی تھی موصوف عالم اور مجاہد خاندان

کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا مولانا عبدالحکیم نے انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں بہ نفس نفیس حصہ لیا۔ بغاوت فرو ہونے کے بعد انھیں برسوں نیپال میں جلا وطنی کی زندگی گذارنی پڑی۔ ان کے بھائی مولانا عبدالرحیم بہار شریف میں اپنے وقت کے جید عالم تھے جن کے شاگردوں میں حضرت شاہ امین احمد فردیسی (۱۲۸۸ھ — ۱۳۷۱ھ) بھی تھے۔ عاصم بہاری انھی بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

موصوف تلاش معاش کے سلسلے میں ۱۹۰۶ء میں کلکتہ پہنچے تو یہاں کھلی ہوئی علمی، سیاسی اور صحافتی فضا ان کی طبیعت کو خوب راس آئی۔ اپنا بیشتر وقت کتب بینی، مولانا قاضی عبدالجبار[1] شیخ پوری اور مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبتوں میں صرف کیا۔ گہرے مطالعہ اور ان صحبتوں نے انھیں اپنے آس پاس کے بے حد پسماندہ ماحول میں اصلاحی کاموں کی طرف مائل کیا۔ برسوں تعلیم بالغان کی اسکیم چلائی۔ چنانچہ ان بے لوث خدمات نے ان کے معتقدوں کا ایک گروہ تیار کر دیا۔ لیکن جہاں معتقد ہوتے ہیں وہاں کچھ نہ کچھ مخالفوں کا ہونا بھی ایک طرح سے لازمی ہے۔ چنانچہ ان پر ایک بار قاتلانہ حملہ بھی ہوا سینے میں گہرا زخم آیا مگر قاتل کو معاف کر دیا۔ اسی درمیان ایک اہم ترین تازہ تصنیف کتاب التمدن[2] (یا تاریخ النوائی و اہلہ حصہ اول و دوم ۱۹۱۱ء) کے مطالعہ نے موصوف کی زندگی میں ایک نیا انقلاب پیدا کر دیا اور اپنے ماحول میں اصلاحی کاموں کا محدود پیمانے پر باضابطہ آغاز کر دیا کیوں کہ کتاب التمدن کے مصنف نے انصاریوں (تنکر برادری) کی پوری تاریخ پیش

---

[1] بانی "انجمن اصلاح رفع بالاشتباہ" ۱۹۰۸-۹ء ثانی باغ، کلکتہ

[2] مصنفہ مولانا عبدالسلام مبارکپوری۔ تاریخ وفات جنوری ۱۹۲۴ء (بحوالہ الومن کلکتہ، جلد ۲ صد ۲ فروری ۱۹۲۴ء)

کرنے کے بعد آخر میں "اپیل بخدمت قوم" کے زیر عنوان انھیں یہ ترغیب دی تھی کہ:

"تم اپنے بچوں کو تعلیم دلانا فرض سمجھو۔ بغیر اس کے آج انسان دوسروں کا دست نگر ہے، اپنی تعلیم گاہوں کے لئے کانفرنس قائم کرو۔ قدم بڑھاؤ۔ جب تک بالخصوص تمہاری کوئی کانفرنس قائم نہ ہوگی تمہارا ابھرنا مشکل ہے۔ تمہاری آبادی دنیا میں بہت بڑھی ہوئی ہے۔ تم میں ہر طبقہ کے لوگ ہیں۔ ممالک اسلامیہ کی فہرست بھی تم نے پڑھی، کیسے کیسے باکمال صناع تم میں گذرے ہیں، کیسے کیسے عالم، فاضل، صاحب کمال ہوئے ہیں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ قرآن کو مضبوط تھامو۔ یہی کتاب تمام دین و دنیا کی ترقی کا راستہ بتائے گی اور حدیث و فقہ پر عمل کی ہدایت کرے گی۔"[1]

چنانچہ موصوف نے بڑی مسجد نانی باغ (کلکتہ) کے آس پاس نوجوانوں کے درمیان اصلاحی کاموں کا باضابطہ آغاز کر کے اس بحر مردار کے پسماندہ مسلمانوں کو اچھوت ہونے سے بچانے کی مہم شروع کر دی۔ انھیں اپنی تحریک کا اولین سبق یہ دیا کہ "اپنے کو کمتر مت جانو اور ہر کمی کو پورا کرو۔"

بہت جلد انھیں یہ احساس ہو گیا کہ کوئی بڑی اور اہم اصلاحی تحریک محض چند تقریروں اور جذباتی اپیل پر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ چنانچہ قریب ترین ۱۰، ۱۲ تجربہ کار اور باصلاحیت احباب کے تعاون سے ایک "دار المذاکرہ" قائم کیا[2] ہفتوں غور و فکر اور بحث کے بعد "دار المذاکرہ" کے اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط طے

---

[1] تاریخ المنوال، حصہ دوم صفحہ ۱۰

[2] بمکان حاجی محمد اسمٰعیل، نانی باغ لین کلکتہ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی زیر ترتیب کتاب "بندۂ مومن کا ہاتھ"

کئے گئے۔ عہدوں کی کشاکش سے بچنے کے لئے ہر چھ ماہ پر ایک امیر المجلس کا انتخاب عمل میں آتا جس کے حکم کی تعمیل ارکان پر لازمی تھی۔ البتہ خلاف شرع احکام و حرکات پر ارکان امیر کو برخاست کرنے کے مجاز تھے۔ اس کے اولین امیر عاصم بہاری منتخب کئے گئے۔

ارکان مجلس نے اپنی تربیت اور داخلی استحکام کے لئے جو "نصاب" مقرر کیا اس میں قرآن پاک مع ترجمہ و تفسیر، حدیث شریف مع ترجمہ و توضیح۔ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، سوانح حضرات صحابہ کرامؓ و صلحائے مجددین امت، اولوالعزم لوگوں کے کارنامے، تاریخ اسلام اور تاریخ عالم پر منتخب کتابوں کے علاوہ اخبار و رسائل بھی شامل تھے "عوام اور اہل قبیلہ" کی تعلیم و تربیت کے لئے ہر سنیچر کو دس بجے شب[1] سے کارروائی کا آغاز ہوتا۔ اور بسا اوقات ایک دو بجے رات تک کارروائی جاری رہتی۔ اولین اجتماعات میں تقریروں کے موضوعات کچھ اس قسم کے تھے "علم کی عظمت" "کتب بینی کی اہمیت" "قوموں کے عروج و زوال کے اسباب" "تنظیمی زندگی کی برکات" وغیرہ مقررین ان موضوعات پر پوری تیاری کے ساتھ آیا کرتے۔ چند ہی ہفتوں کے بعد جگہ کی تنگی کے باعث اجتماعات مسجد کی پشت[2] پر کھلی جگہ میں منعقد ہونے لگے۔

دار المذاکرہ کے اغراض و مقاصد میں "دینی و دنیوی فلاح" "تعصبات فرقہ بندی (ذات پات) سے اجتناب۔ کوشش اتحاد باہمی، احتساب ہفتہ وار مجلس[3]، مفید

---

[1] کیونکہ بیشتر شرکاء مزدور پیشہ اور غریب ہوا کرتے تھے جنھیں دن میں فرصت نہیں ملتی تھی۔

[2] جہاں ان دنوں ایک مدرسہ ہے۔

[3] ابتدا میں سہ روزہ اجتماعات ہوا کرتے تھے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "بندۂ مومن کا ہاتھ" زیر ترتیب از راقم الحروف (مفصل سوانح حیات عاصم بہاری و تاریخ آل انڈیا مومن کانفرنس)

موضوعات پر تقریر و تحریر اور کتب خانہ کے قیام کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔

دار المذاکرہ کے اجلاس پنجم (منعقدہ ۲۵ رجولائی ۱۹۱۹ء مطابق ۲۶ رشوال ۱۳۳۷ھ) میں تفسیر و سیرت کی کتابوں کے انتخاب پر دیر تک اظہار خیال کے بعد مندرجہ ذیل تصانیف کا انتخاب عمل میں آیا۔

"حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا فارسی ترجمہ قرآن پاک
ڈپٹی نذیر احمد مرحومؒ کا ترجمہ قرآن مجید
سیرت النبیؐ۔ علامہ شبلی نعمانی
رحمت اللعالمینؐ، سوانح صدیق اکبرؓ، الفاروقؓ، سوانح ذی النورینؓ
سوانح مرتضیٰ حیدرؓ، سوانح عمر بن عبدالعزیزؒ، نظام الملک (ترجمہ)
اقوام المسالک، تذکرۃ الکرام، ماثر الکرام۔ انقلاب امم، فغان ایران"

۱۵ اگست ۱۹۱۹ء کی مجالس میں تقریر کے اہم عنوانات تھے "توحید، مساوات اور دوستی" وغیرہ ماہ ستمبر میں مولانا آزاد کا مقالہ "عید الضحیٰ" (قسط وار مقالہ شائع شدہ الہلال جلد اول) خصوصیت کے ساتھ مجلس کے زیر مطالعہ رہا۔

جلد ہی خلافت تحریک اور جلیانوالہ باغ کے حادثے نے پورے ملک کو ایک نئے رخ پر ڈال دیا۔ چنانچہ عاصم بہاری نے اب بہار اور بنگال پیمانے پر "جمعیۃ المومنین" کے نام سے ایک باضابطہ تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔ اس تنظیم کے خاکے سے بھی ہم موصوف کے طریقہ تربیت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

اولے تنظیم:

(الف) مقامی۔ یعنی ہر جگہ ذی علم و معززین و سرداران سے مرکب ایسی پنچایت (ذمی تاحیں) ہو جو ذمہ دارانہ طور پر مقامی کاموں کو شریعت اسلامیہ کے مطابق انجام دے۔

(ب) مرکزی۔ یعنی تمام اضلاع بہار کے نمائندے ایک جماعت کا انتخاب

کریں جو پورے صوبے بہار کے کاموں کی نگرانی کرے اور قبیلہ کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری معلومات بہم پہنچائے اور ششماہی یا سالانہ صوبہ کی کانفرنس منعقد کرائے جلد از جلد ہفتہ وار یا دو ہفتہ رسالہ جاری کرنے کا بندوبست کرے۔

دوم، تعلیم:

(الف) عام۔ جو تمام افراد قبیلہ کے واسطے ضروری ہو اور تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ انجام پائے۔

(ب) خاص۔ صرف بچوں کے لئے جس میں سب سے زیادہ توجہ تربیت پر دی جائے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سامان بہم پہنچایا جائے۔

سوم، اصلاح معاشرت

(الف) اخلاق — یعنی غیر شرعی و فضول رسم و رواج کو بتدریج مٹانے کی کوشش کرنا۔

(ب) اقتصادی — مفید صنعت و تجارت کی طرف راغب کرنا اور موجودہ صنعت پارچہ بافی کو فنی حیثیت سے ترقی دینا۔ جمعیت کا دائرہ عمل قبیلۂ نورمانان تک محدود ہو۔

سچ پوچھئے تو آگے چل کر آل انڈیا مومن کانفرنس کی پوری تحریک بھی انہی خطوط پر آگے بڑھی عاصم بہاری نے تاحیات توسیع مقاصد کے باوجود تحریک کی ان دینی و اخلاقی بنیادوں کو اپنی حد تک کبھی کمزور نہیں ہونے دیا۔

اس سلسلے میں دور اوّل ہی سے مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور دیگر اکابر ملت سے وقتاً فوقتاً اصلاح و مشورے کرتے رہے اور کبھی کبھی انھیں اپنے جلسۂ عام[1] میں مدعو بھی کرتے رہے۔

---

[1] ۱۰ مارچ ۱۹۲۱ء کے جلسہ نانی باغ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تقریر کی۔

آگے چل کر جمعیۃ المومنین نانی باغ کی رکنیت کے لئے "عہد نامہ" کی جو شرائط مقرر کی گئیں ان میں اسلامی بنیادوں کو اولین اہمیت دی گئی۔ رکنیت قبول کرنے کے وقت ہر رکن یہ عہد کرتا تھا کہ:۔

۱۔ آئندہ میں کسی قسم کا نشہ استعمال نہیں کروں گا۔
۲۔ ہمیشہ فسق و فجور سے پرہیز کروں گا۔
۳۔ اپنے بزرگوں کی عزت و احترام کروں گا۔
۴۔ اپنے قبیلہ یا دیس کا بنا ہوا کپڑا پہنوں گا۔
۵۔ ہر ہفتہ دو گھنٹہ محض رضائے الٰہی کے لئے مسلمانوں کے فلاحی کاموں میں صرف کروں گا اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں اپنے سردار کے حکموں کی تعمیل کروں گا۔

جلد ہی نوجوان کارکنوں کا ایک "رضا کار دستہ" بھی مرتب کر لیا گیا جس کی ایک مخصوص وردی تھی اور جو شہر کے مختلف مواقع پر خدمت خلق کے بیش بہا کام انجام دیتا۔ اپریل ۱۹۲۱ء سے ان اغراض و مقاصد کو مزید شہرت دینے کے لئے انھوں نے دیواری اخبار "المومن" کا بھی سلسلہ شروع کیا رفتہ رفتہ یہ تحریک بہار و بنگال کے طول و عرض میں جڑ پکڑنے لگی اور انھیں تربیت یافتہ افراد کی کمی کھٹکنے لگی تو داخلی تربیت و استحکام کے لئے لیڈر شپ ٹریننگ کے ایک مخصوص نظام کو میثاق (یا اتحاد خاندان ۲۳ اگست ۱۹۲۴ء) کے نام سے بہار شریف میں آگے بڑھایا۔ فوری طور پر اس تنظیم میں "جانثار آرہ و احباب داعزہ" کے علاوہ کسی اور کو شامل نہیں کیا۔ اس تنظیم کی شورائیت، اطاعت امیر، عقیدہ سنت والجماعت، ماہانہ اور سالانہ نشستوں کی پابندی میں بڑی سختی تھی۔ اولین رئیس میثاق (یا "اتحاد") عاصم بہاری منتخب کئے گئے۔ ارکان میثاق کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کا اقرار کرنا لازمی قرار دیا گیا۔

۱۔ اقرار شرعی کرنا (الفاظ میں)

۲۔ اطاعت رئیس اتحاد
۳۔ شرکت اجلاس سالانہ (۵ ذی الحجہ تا ۵ محرم الحرام)
۴۔ اتحاد خاندان کی طے شدہ باتوں کی رازداری کرنا۔
۵۔ بغیر اجازت "اتحاد" کسی شخص پر تبلیغ نہیں کرنا۔
۶۔ عہد کے پہلے کی تمام رنجشوں اور قصوروں کو باہم دگر معاف کرنا۔
۷۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کرنا ورنہ عدم تعمیل پر احتساب بلا عذر کرنا۔
۸۔ اپنے آمد وخرچ کا برابر حساب رکھنا اور اس کا خلاصہ سالانہ اجلاس میں پیش کرنا۔
۹۔ اپنی آمدنی سے فی روپیہ ایک پیسہ ماہوار "اتحاد" میں دینا۔
۱۰۔ ایسی تمام باتوں سے پرہیز کرنا جس میں "اتحاد خاندان" کی بدنامی ہو۔
۱۱۔ اپنے خاندان کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے ایسا کامیاب بنانا جو دینی اور دنیاوی طور پر نمایاں مثال ہو۔

اگلے سال[1] میثاق کی گذشتہ کارروائیوں کا سختی سے محاسبہ کیا گیا۔ دفتری مراسلت میں کمی، صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور اعانت بیت المال میں کوتاہی پر تنقید کی گئی۔ اس سالانہ نشست میں میثاق کے ایک رکن (محبوب حسین، کلکتہ) بلا عذر معقول شریک نہ ہو سکے تو سال رواں کے نئے رئیس محمد نسیم الحق ایوبی نے حکماً ان کا سوشل بائیکاٹ کر دیا۔ محبوب حسین نے بعد میں معذرت نامہ ارسال کیا اور توبہ کی تب ان کو دوبارہ اجازت دی گئی۔ اسی طرح ایک سال (۱۹۲۶ء) محمد علی جان[2] کو ان کی کوتاہیوں کے سبب رکنیت سے خارج کر دیا گیا تھا۔ ایک اور رکن عبدالطیف کے خلاف بھی کارروائی کی گئی مگر ان کا عذر معقول پایا گیا اس لئے ان کا اخراج رک گیا۔

---

[1] ۷ محرم ۱۳۴۴ھ مطابق ۲۹ جولائی ۱۹۲۵ء
[2] ساکن محلہ سوہ ڈیہہ، سوہ سرائے ضلع نالندہ (بہار)

ان تربیت یافتہ افراد کے اشتراک وتعاون سے عاصم بہاری نے پورے بہار شریف کو دینی وعلمی اور تہذیبی اعتبار سے بیدار کرنے کے لئے محلہ وار "دارالتربیت"[1] بھی قائم کیا۔

سید مہدی حسن وکیل کی نظامت میں جمعیۃ اسلامیہ بہار شریف قائم ہوئی تو ملی جذبے کے ماتحت موصوف نے اس تنظیم کو اپنا بھرپور تعاون پیش کیا یوں یہ جمعیۃ کئی برسوں تک خاصی سرگرم رہی۔ راجہ بازار (کلکتہ) کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو "مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی" قائم کرنے پر آمادہ کیا تو انھیں بھی دینی و اخلاقی اصولوں پر ہمیشہ کاربند رہنے کی تلقین کی اور عمر بھر خود بھی ان بنیادوں پر تمام تنگیوں کے باوجود سختی سے عامل رہے جس کی گواہی خود مولانا ابوالکلام آزاد نے جمعیۃ المومنین کے ایک جلسہ (منعقدہ نانی باغ کلکتہ۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۲۱ء) میں اپنے تقریر میں[2] پیش کیں۔

"تم کو خداوند تعالیٰ کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ تمہارے درمیان ایسے بھی خواہ قوم موجود ہیں جنھوں نے تمہاری بہتری و اصلاح کی دھن میں اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے"۔

عاصم بہاری اصلاً ہمہ گیر اصلاح کے لئے کھڑے ہوئے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تحریر و تقریر میں بارہا انگریزوں اور زمینداروں کے ظلم و ستم، علمائے سوء اور "سفری پیروں" کے مکر و فریب نیز برادری کے ہر سہ قسم کے سرداروں (معصم معروف اور مسموم) کی ریشہ دوانیوں اور غربت و جہالت کو قرآن و سنت کی روشنی میں ہمیشہ اپنی طنزیہ و تنقید کا نشانہ بنایا۔

---

[1] جو ایک لائبریری، ایک مکتب یا مدرسہ پر مشتمل ہوتا اور جس کی ماہانہ نشستیں پابندی سے منعقد ہوتیں یہ اصلاً جمعیۃ الانصار (یا جمعیۃ المومنین) کی ذیلی شاخیں تھیں۔ [2] ابتدائے خیال صفحہ ۲

عاصم بہاری کے اسی فکر اسلامی کا یہ نتیجہ تھا کہ آل انڈیا مومن کانفرنس کے دور عروج میں جب اس کا "دستور العمل" منظور ہوا[1] تو اس کے چار اغراض و مقاصد میں جس شق کو اولیت حاصل تھی اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

"اسلام و ملک کی عام خدمت، بالخصوص اسلامی مساوات کی عملاً و قولاً تبلیغ و اشاعت"۔ آگے چل کر مومن کانفرنس عاصم بہاری جیسے "مومن حنیف" سے چونکہ محروم ہوگئی اس لئے خالص سیاست کا شکار ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ کل ہند مومن کانفرنس کے اجلاس نہم (منعقدہ پٹنہ ۱۹۴۸ء) میں جو "دستور اساسی" منظور کیا گیا، اس کا مقصد[2] اس فکر اسلامی سے یکسر خالی ہو گیا جس کے لئے عاصم بہاری زندگی بھر جد و جہد کرتے رہے۔ لہٰذا اس کے نتائج بھی اس کی مناسبت سے نہایت تلخ اور مایوس کن ثابت ہوئے اور اسے چند سیاسی و اقتصادی اغراض کے حصول کا ذریعہ بنا کر چند قسمت آزما اور حوصلہ مند افراد نے اپنا آلہ کار بنا لیا۔ کاش! کہ اب بھی لوگ عاصم بہاری کے طریق کار اور انداز تربیت کا ایمانداری سے مطالعہ کریں اور اپنے عمل کا جائزہ لیں۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

---

[1] ۱۰ فروری ۱۹۳۵ء۔ دستور کے "نوٹ" میں یہ اضافہ کیا گیا کہ "اس کانفرنس کو اختلافی مسائل مذہبی اور غیر آئینی جد و جہد سے کوئی سروکار نہ ہوگا"۔

[2] "دفعہ ۴ مومن جماعت کی اقتصادی، سماجی، تمدنی اور تعلیمی فلاح و بہبود اور اس کے حصول کے ذرائع پر عمل کرنا۔